خدا بخش لائبریری

جرنل

۱۹

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

Ref. Room

خدابخش لائبریری

جرنل

Khuda Bakhsh Library
Acc. No. 21941
6-9-82

۱۹

• خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۳۲۲۲۳/۷۷

مجلس ادارت

- قاضی عبدالودود (چیرمین)
- سید حسن عسکری
- افسر الدولہ فیاض الدین حیدر
- عابد رضا بیدار (سکریٹری)

انیسواں شمارہ : ۱۹۸۱ء

اس سالانہ مجلے میں انگریزی، اُردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے جو خدابخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہوں، یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں

قیمت : پندرہ رُپے

سالانہ زر خریداری		
	اندرون ملک :	۶۰ رُپے
	پاکستان :	۱۲ ڈالر
	یوروپ :	۸ پونڈ
	امریکا اور دیگر ممالک :	۲۴ ڈالر

- محبوب حسین نے اُردو حصہ، پٹنہ لیتھو پریس، دمنائین پٹنہ ۴ میں اور انگریزی حصہ ہندستان پرنٹنگ ورکس رامپور (یوپی) میں چھپوا کر خدابخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا۔

فہرست

ذاکر صاحب — ذاتی یادیں	از ڈاکٹر مسعود حسین	۱
"	از جناب خورشید عالم خاں	۲۵
"	از بیگم صالحہ عابد حسین	۳۵
"	از جناب عبداللطیف اعظمی	۴۷
"	از بیگم انیس قدوائی	۶۷
مشاہیر کی محسن کتابیں		۷۳
خدابخش لائبریری کے چند اہم و نادر مخطوطات	از حکیم محمد عمران خاں	۸۱
غالب، یاس یگانہ اور حسرت عظیم آبادی	ادارہ	۸۷
تصحیح و اضافہ: خدابخش لائبریری کے عربی و فارسی مخطوطات کی فہرست مجمل کے چند اغلاط	از جناب وسیم احمد اعظمی • عابد رضا بیدار • جناب محبوب حسین	۸۹ / ۹۱ / ۹۳
مراسلات: عنایت خاں راسخ کے سلسلے میں	از جناب احمد یوسف	۹۷
تدوین متن کے مسائل کے بارے میں	از جناب رشید حسن خاں • جناب رئیس نعمانی	۹۸ / ۹۹
قمر گیاوی (وغیرہ) کے بارے میں	از ڈاکٹر کلیم سہسرامی	۱۰۰
رسالہ 'ادیب' کے بارے میں	از جناب عشرت حسین آزاد	۱۰۱
غزلیات سلمان ساوجی - استدراک کے بارے میں	از جناب محمد عمر سیفی	۱۰۲
دین و دانش: علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں (از جناب سید ابوالحسن علی ندوی) — نئی کتابیں		۱۰۳
تبصرہ: فرہنگ آصفیہ (۵)	از جناب قاضی عبدالودود	۱۰۵
ملک بیو اور اس کا عہد (انگریزی)	از پروفیسر سید حسن عسکری	۱

اس شمارے کے لکھنے والے

- **ڈاکٹر مسعود حسین:** (پ ۱۹۱۸ء تقریباً) ڈاکٹر ذاکر حسین کے بھتیجے، پیرس سے ڈی۔ لٹ۔ سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ، سابق پروفیسر لسانیات عثمانیہ و مسلم علی گڑھ۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۴ ملاحظہ ہو۔
- **جناب خورشید عالم خاں:** (پ ۱۹۱۹ء) ڈاکٹر ذاکر حسین کے داماد، وزیر مملکت برائے سیاحت و شہری ہوابازی حکومتِ ہند، تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۶ ملاحظہ ہو۔
- **بیگم صالحہ عابد حسین:** (پ ۱۹۱۳ء) جامعہ میں ذاکر صاحب کی ہمکار، خواجہ غلام الثقلین کی صاحبزادی اور ڈاکٹر سید عابد حسین کی بیگم، اُردو کی مشہور ادیبہ و افسانہ نگار۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۳۰ ملاحظہ ہو۔
- **جناب عبداللطیف اعظمی:** (پ ۱۹۱۷ء) ڈاکٹر ذاکر حسین کے شاگرد اور جامعہ میں ان کے رفیق کار، سابق ایڈیٹر ماہنامہ صبح وغیرہ، ماہنامہ جامعہ کے مدیر اور پھر مدیر معاون)، تفصیل کے لیے اسی شمارے کا صفحہ ۴۸ ملاحظہ ہو۔
- **بیگم انیس قدوائی:** (۱۹۰۸ء – ۱۶ جولائی ۱۹۸۲ء) انگریزی اور اُردو کی ممتاز ادیبہ، مولانا محمد علی کے جواں مرگ رفیق ولایت علی بمبوق کی صاحبزادی اور رفیع احمد قدوائی کی چچا زاد بہن اور بھاوج؛ سابق ممبر راجیہ سبھا، تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۶۶ ملاحظہ ہو۔
- **حکیم محمد عمران خاں:** (پ ۱۹۲۹ء) ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی ٹونک (راجستھان) سے وابستہ اسکالر
- **جناب وسیم احمد:** (پ ۱۹۵۶ء)، بی، یو، ایم، ایس (لکھنؤ طبیہ کالج)، خدابخش لائبریری میں لٹریری ریسرچ یونٹ (طب یونانی) سے وابستہ۔
- **جناب احمد یوسف:** (پ ۱۹۳۲ء تقریباً) اردو کے معروف افسانہ نگار اور ناقد۔ افسانوی مجموعے: روشنائی کی کشتیاں، آگ کے ...
- **جناب رئیس نعمانی:** (پ ۱۹۵۰ء تقریباً) پوشین اکیڈمی لکھنؤ کے بانی، 'عبارت' فارسی مجلّہ کے مدیر۔
- **ڈاکٹر کلیم سہسرامی:** (پ ۱۹۳۲ء تقریباً) تہران سے ڈی۔ لٹ، راجشاہی یونیورسٹی (بنگلہ دیش) میں شعبۂ لسانیات کے پروفیسر۔
- **جناب مسرت حسین آزاد:** (پ ۱۹۵۰ء تقریباً) سکریٹری صولت پبلک لائبریری رامپور؛ سابق ایڈیٹر 'الفاروق' وجوہر۔ ادارہ فروغ اردو (اب شاد عارفی) لائبریری کے مالک۔
- **جناب محمد عمر سیفی ٹونکی:** (پ ۱۹۳۰ء تقریباً) ادبی ذوق کے حامل، ٹونک کے نجی کتابی ذخیروں میں آپ کا ادبا و شعرا کے خطوط اور رسائل کا اچھا کلکشن ہے۔

بقیہ کے لیے ملاحظہ ہو جرنل شمارہ ۱، ۱۲ اور ۱۶

••

ذاکر صاحب - ذاتی یادیں

پیشگفتہ

ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۸۹۵ - ۱۹۶۹ء) کے اقوال و افعال کے بارے میں قریبی لوگوں کی ذاتی یادوں کا ایک مرقع پیش کیا جا رہا ہے، اس میں نظر کے گوناگوں زاویے ملیں گے لیکن ہر زاویے سے تصویر کا ایک ہی رنگ اُبھرتا دکھائی دے گا، خلوص اور لگن سے کاڑھی ہوئی اخلاقی شخصیت کا رنگ جس نے اخلاق الٰہی تک پہنچنے کے لیے ابن آدم کا بتایا ہوا راستہ اختیار کیا تھا، خدمت سے عظمت کا راستہ!

بڑی شخصیتوں کے افعال و اقوال، ان کے بعد آنے والے اپنے بعد آنے والوں کے لیے، مرتب کر جاتے ہیں کہ انھیں سُن کے، پڑھ کے اگر اپنے اندر اہلیت اور صلاحیت ہو تو، ایک شخصیت بر تر وجود میں آسکے کہ یہ برتر سے برترین تک حصول شخصیت کا سفر ہی ساری انسانی تگ و دو کا ماحصل ہے۔

اب تک صوفیہ کے ملفوظات بکثرت سامنے آتے رہے ہیں جن میں متصوفانہ شخصیت میں بھی ایک عظمت ہے لیکن وہ سامنے اس طور سے لائے گئے ہیں کہ پوجنے یا ڈرنے کے رہ گئے ہیں۔ کوئی نقش کف پا ایسا نہیں جس پر کوئی دوسرا بھی چلنے کی جرأت کر سکے، ہمت لا سکے۔ اخلاقی شخصیت، اسی ہماری آپ کی بھلی بری دنیا میں رلی ملی شخصیت ہوتی ہے جو زندگی کے ہر اونچ نیچ سے گزرتی، اپنا احتساب کرتی اور کراتی، دوسروں کے لیے جی کر خدمت کے راستے، اپنے کو گوندھتی کاڑھتی اور خدائی اخلاقی سانچے میں ڈھالتی ہوئی، اردگرد کو روشنی کے سیلاب میں نہلا جاتی ہے۔

مشہور صوفی حضرت عبدالقدوس گنگوہی کا ایک قول ہے کہ محمد عربی معراج میں آسمانی بلندیوں کے آخری نقطے تک جا کے لوٹ آئے۔ قسم خدا کی،

ان کی جگہ میں ہوتا تو ہرگز واپس نہ آتا۔ اقبال نے یہ قول دہراتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک صوفی اور ایک نبی میں یہی فرق ہے کہ صوفی اپنا تجربہ اپنے تک محدود رکھ کر خود لطف اندوز ہونا کافی سمجھتا ہے، پیغمبر اپنے تجربے کی روشنی اور حرارت کو لیکر پھر زمان و مکان کی دنیا میں واپس آتا ہے کہ تاریخ سازی کر سکے۔ رسول اللہؐ کی ذات میں متصوفانہ شخصیت اور اخلاقی شخصیت کا حسین ترین امتزاج مل جاتا ہے۔

○

ذاکر صاحب کی شخصیت ایک اخلاقی شخصیت تھی، جو متصوفانہ شخصیت کے عناصر اپنے اندر سموتی جاتی تھی کہ بلاوا آگیا اور شخصیت سازی کا یہ سفر ادھورا رہ گیا! ایک حقیر زندگی میں یہ سفر کس نے پورا کیا ہے!! لیکن اسی انسانی بے بسی میں انسانی عظمت کا اشارہ پنہاں ہے: محدود کا لامحدود کو چھو لینے کا عزم بھی! بے بس ہوتے ہوئے انسان کیسا عظیم بالشان ہے: کتنا حقیر اور کیسا عظیم!

○

جامعہ اور علیگڑھ کو حیات نو بخشنے کے بعد لکھا یوں ہی تھا کہ بہار کے عظیم ترین ملّی علمی ادارے خدا بخش کو بھی ذاکر صاحب کے ہاتھوں نئی زندگی ملے۔ وہ ۱۹۵۷ء میں گورنر ہو کر آئے اور جب ۱۹۶۲ء میں بہار چھوڑا تو خدا بخش کو ایک مضبوط بنیاد فراہم ہو چکی تھی۔

ذاکر صاحب کہا کرتے تھے جو ملت اپنے محسنوں کے احسانات کو بھلا دیتی ہے، خدا اس پر محسن اتارنا بند کر دیتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کبھی اس بشارت کے مخاطب ہم بنیں۔

خدا بخش لائبریری نے اپنے محسن کی یاد میں ذاتی یادوں کو منضبط کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جنھیں رفتہ رفتہ ایک مرتب شکل دی جاتی رہے گی۔

عابد رضا بیدار ●●

ڈاکٹر مسعود حسین

● **ڈاکٹر مسعود حسین** (پ ۱۹۱۸ء) پیرس سے ڈی لٹ، علی گڑھ کے طالبعلم رہے اور پھر وہیں لکچرار اور ریڈر رہے؛ پھر لسانیات کے پروفیسر ہو کر عثمانیہ چلے گئے جس کے بعد جامعہ کے وائس چانسلر ہوئے۔ پھر علیگڈھ سے لسانیات کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ آج کل کشمیر کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں وزٹنگ پروفیسر۔

اہم تالیفات: (۱) رقعات رشید احمد صدیقی، (۲)؛ اردو کا المیہ (۳) قدیم اُردو (تین جلدوں میں)؛ (۴) شعر و زبان؛ (۵) قصہ مہر افروز و دلبر از عیسوی خان بہادر (۶) مقدمہ تاریخ زبان اُردو (۷) دکنی اُردو کی لُغت (۸) دو نیم (کلام کا مجموعہ) (۹) کومی مسعود کا گیت (ہندی میں کلام کا مجموعہ)، (۱۰) اُردو کی لسانیاتی تاریخ: خدا بخش لکچر (زیر طبع)

ذاکر صاحب پر سلسلۂ خطبات کا افتتاح ۲۳ اپریل ۱۹۸۰ء کو ڈاکٹر مسعود حسین کے اس خطبہ سے ہوا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب، ذاکر صاحب کے بڑے بھائی مظفر حسین صاحب کے بیٹے ہیں

یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ خطبہ زبانی جس طرح بولا گیا، من و عن اسی طرح 'روزمرہ' میں شائع ہو رہا ہے، کسی جگہ کسی ذرا سی بھی لفظی یا اسلوبی ترمیم کے بغیر۔

عزت مآب ڈاکٹر قدوائی صاحب، بیدار صاحب، بزرگو اور دوستو!

میں دراصل، جیسا کہ آپ کے علم میں ہے، پٹنہ آیا تھا کسی اور کام کے لئے، لیکن جب بیدار صاحب نے مجھ سے یہ خواہش کی کہ انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے سلسلے میں خطبات اور تقاریر کا ایک سلسلہ خدا بخش لائبریری میں شروع کیا ہے اور چاہتے ہیں کہ میں اس سلسلہ کی پہلی تقریر کروں، تو مجھے خوشی بھی ہوئی اور تھوڑی سی ہراسانی بھی! ہراسانی اس لئے کہ ذاکر صاحب سے نہ صرف میری قرابت ہے بلکہ قرب بھی رہا ہے۔ اتفاق سے، اپنی اسکول کی تعلیم کے شروع سے، میں چونکہ جامعہ کا طالب علم رہا، تو اس لحاظ سے مجھے، کم و بیش دس بارہ سال تک ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ کچھ عرصے تک بورڈنگ میں رہا لیکن بورڈنگ بہت پاس تھا، اور ہر وقت اُن کے وہاں آنا جانا تھا اور کچھ عرصے خود ان کے مکان پر ان کے ساتھ رہا۔ اسی لئے میں کہہ رہا ہوں کہ قرابت کے علاوہ قرب بھی رہا ہے۔ اکثر ہوتا ہے کہ قرابت داری میں قرب نہیں ہوتا ہے، فاصلے ہوتے ہیں۔

لیکن تھوڑی سی پریشانی مجھے اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ جس طریقہ سے کہ کسی اچھی تصویر کو فوکس میں لانے کے لئے ایک فاصلۂ مکانی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طریقے سے کسی بھی عزیز شخصیت کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے، اس پر بولنے یا لکھنے کے لئے، یقیناً ایک فاصلۂ زمانی کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ آپ نہ تو شبلی کے الفاظ میں 'مدلل مداحی' کریں نہ آپ قرابت داری کے زیر اثر کچھ ایسی عقیدت مندانہ باتیں کہہ جائیں جو کہ عام پبلک، عام لوگوں، کا ذہن قبول کرنے کو تیار نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں، آپ اس شخصیت سے بھی انصاف کریں، اپنے سے بھی انصاف کریں اور جنھیں مخاطب کر رہے ہیں ان سے بھی انصاف کریں۔ اس لئے میں نے بیدار صاحب سے عرض کیا کہ میں اس وقت ان کے کارنامے، ان کے کام، وہ چاہے تعلیمی میدان میں ہوں، سیاسی میدان میں ہوں، ان سے میں بحث نہیں کروں گا، چونکہ اس بارے میں لوگ لکھتے رہے ہیں، لکھتے رہیں گے اور وہ چیزیں سب کے سامنے

ہیں — میں اپنی اس تقریر کو ان چند یادوں سے موسوم کروں گا جو میرے ذہن میں ان کی شخصیت کے تاثر کے طور پر محفوظ رہ گئی ہیں؛ یا چند ایسے واقعات، چھوٹے چھوٹے واقعات، گھریلو واقعات، جن سے ان کی شخصیت کے کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہے اور جو غالباً تاریخ کا حصہ نہ بن سکیں گے اگر میں انھیں نہ کہوں کہ وہ میرے ساتھ ختم ہو جائیں گے۔

ذاکر صاحب سے میرا پہلا سابقہ اس وقت ہوا جب سن ۱۹۲۶ء میں وہ برلن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر اپنے وطن قائم گنج ضلع فرخ آباد واپس آئے۔ اس وقت میری عمر غالباً چھ، سات برس کی تھی۔ اس سے قبل کے ذاکر صاحب میرے ذہن میں نہیں ہیں، اس لئے کہ وہ تین سال، چار سال یوروپ میں رہ کر آئے تھے۔ اور اس سے قبل میں اتنا چھوٹا تھا کہ کوئی تصویر میرے ذہن میں نہیں بنتی۔ اس دن قائم گنج کے قصبے میں دھوم تھی کہ پہلا پٹھان اور پہلا قائم گنجی باہر سے ایک ڈگری لے کر آرہا ہے۔ چنانچہ نہ صرف اہل خاندان بلکہ اور بھی دور کے عزیز اور قرابت دار سب لوگ، اسٹیشن پر موجود تھے۔ بلکہ، ایک عزیز تو کچھ شادیانے بھی لیکر پہنچ گئے تھے، اس قسم کی چیزیں جو عام طور سے شادی کے موقع پر کرایہ پہ لے لی جاتی ہیں، اس کا انتظام کر لیا تھا۔ میں ایک ملازم کی گود میں تھا، اس وقت؛ کھڑا ہوا انتظار کر رہا تھا کہ گاڑی کا انجن دکھائی دیا۔ تھوڑی دیر میں گاڑی آئی، ٹھہری اور اس کے بعد ذاکر صاحب اترے تو لوگوں نے گھیر لیا۔ ان کے چہرے پر کالی زلق داڑھی تھی۔ معلوم نہیں انھوں نے بمبئی یا کہاں سے ایک سفید شیروانی حاصل کر لی تھی، وہ پہنے ہوئے تھے؛ اسی شیروانی کے کپڑے کی ٹوپی بھی تھی، ان کے سر پر۔ غالباً بمبئی میں کچھ قیام کیا تھا، وہاں بنوائی ہوگی یا کسی سے حاصل کی ہوگی۔ اور وہ ہر ایک سے مل رہے تھے، اپنے مخصوص انداز سے؛ ہر شخص یہ سمجھ رہا تھا کہ گویا ذاکر صاحب اسی کے لئے مخصوص ہیں اور سارا خلوص جو ہے اسی کے لئے وقف ہے۔ میں ملازم کی گود میں اس لئے تھا کہ مجمع بہت زیادہ تھا اور ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تو، کچھ ایک معاندانہ کیفیت میرے دل میں پیدا ہوئی کہ بھئی صاحب، چچا ہمارے ہیں، اور ہمیں ان تک پہنچنے کی بھی اجازت نہیں! ——— ایک چھ سات سال کے بچے میں جس قسم کی ایک نفسیاتی لہر آتی ہے! وہ بھی ادھر ادھر دیکھ رہے تھے؛ مجمع تمام کھڑا ہوا تھا؛ کوئی ہاتھ ہلا رہا تھا، کوئی کچھ کہہ رہا تھا، کوئی ہار پھول ڈال رہا تھا۔ پھر انھوں نے کسی سے پوچھا یہ بچہ کون ہے؟

اس لئے کہ وہ بھی مجھے اتنا چھوٹا دیکھ چکے تھے کہ کوئی تصویر ان کے ذہن میں میری محفوظ نہیں رہی تھی، لیکن قیاس کر رہے تھے۔ خیر، کسی نے بتایا تو وہ مجمع کو چیرتے ہوئے فوراً میری طرف آئے، مجھے گود میں لیا۔ اور اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ذاکر صاحب دوسروں کے لئے مخصوص یا وقف نہیں ہیں بلکہ یہ میرے لئے وقف ہیں اس لئے کہ ان کی تمام تر توجہ کا مرکز اس کے بعد میں ہی بن گیا، اور مختلف قسم کے سوالات انھوں نے کرنا شروع کئے۔ غالباً اس میں ان کا یہ جذبہ بھی تھا کہ میں ان کے بڑے بھائی کا بچہ تھا اور چونکہ میرے والد کا انتقال دو تین برس کی عمر میں ہو چکا تھا، اسی حالت میں وہ مجھے چھوڑ گئے تو تو ایک نام قسم کا جذبہ جو جذبہ فطری ہوتا ہے، پدری، یا کچھ ہوتا ہے وہ اُمنڈ آیا۔

پھر وہ چند روز رہنے کے بعد جامعہ ملیہ چلے گئے، جہاں انھوں نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے جامعہ کا چارج لیا۔ کیونکہ آتے ہی وہ شیخ الجامعہ بنا دیے گئے تھے۔ اب اُن کو فکر یہ ہوئی کہ قائم گنج کے چھوٹے سے قصبے میں جہاں نہ کوئی اچھا اسکول تھا، نہ کچھ تھا، میری تعلیم اچھی نہیں ہو رہی ہے اور بقول اُن کے میں وہاں پہ ڈنڈے بجاتے پھر رہا ہوں۔ مجھے کسی طریقے سے یہاں سے منتقل کیا جائے۔ چنانچہ اگلے سال میں سن ۱۹۲۷ء میں ان ہی کی تحریک پر میں جامعہ ملیہ کے درجہ دوم میں داخل ہوا۔ اُس وقت جامعہ ملیہ قرول باغ میں تھی۔ ذاکر صاحب کے پاس ایک چھوٹا سا مکان تھا جس میں وہ رہتے تھے۔ اُس وقت جامعہ ملیہ کا ادارہ مختلف کرایہ کی عمارات میں منتشر تھا۔ کہیں پہ کالج تھا، کہیں پہ اسکول تھا، کہیں پہ ایک بورڈنگ ہاؤس تھا، کہیں پہ دوسرا تھا۔ اس وقت کا قرول باغ شہر دلی کی بہت ہی ایک دُور افتادہ جگہ تھی، اور ایسا نہیں تھا جیسا کہ آج کل ہے۔

مجھے بورڈنگ میں ڈالا گیا، چونکہ خیال یہ تھا کہ جامعہ کے بورڈنگ ہاؤس کی تربیت جو ہے وہ ضروری ہے۔ تاکہ وہ تمام اثرات جو قائم گنج کی فضا کے ڈنڈے بجانے کے میرے اوپر پڑے تھے وہ دُھل جائیں۔ پٹھانوں کی بستی تھی، تو وہاں پٹھانوں کے بچے ڈنڈے ہی بجاتے پھرتے تھے، اور کوئی کام پڑھنے لکھنے کا کرتے نہیں تھے! میں اکثر شام کو، دوسرے دن، تیسرے دن مکان پر بھی جاتا رہتا تھا، اور بورڈنگ میں تو رہتا تھا ہی۔ یہ ذاکر صاحب کے عزم کا زمانہ تھا، اس کے ساتھ ساتھ افلاس کا زمانہ تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب سو سوا سو، اور بعد کو پچھتر روپے ان کی تنخواہ تھی، اور یہی وہ زمانہ تھا جب جامعہ کے تمام کارکنوں نے یہ طے کیا تھا ________ کارکن گیا، مولانا محمد علی (وغیرہ) اور حکیم اجمل خاں

خاں نے ـــــــ کہ ہمیں جامعہ کو اب بند کردینا چاہیئے اس لئے کہ ہم اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے ہیں ؛ تو اس وقت ذاکر صاحب کی تحریک پر پندرہ، بیس جاں بازوں کے ایک قافلہ، ایک ٹولی نے عزم کیا کہ جامعہ کو بند نہیں ہونے دیں گے اور اس عزم کے ساتھ، وہ جتنے جامعہ کے مربی تھے ان سے ملا۔ اُس وقت حکیم اجمل خاں اور دوسرے لوگوں نے یہ سوال اٹھایا کہ بھائی کام کیسے چلے گا، کمیٹی کچھ دینے کو اب تیار نہیں ہے ؛ ہمارے ذرائع بھی محدود ہیں ؛ اخراجات بڑھ رہے ہیں تو انھوں نے کہا کہ ہم اپنی تنخواہیں بند کرلیں گے، لیکن جامعہ کو بند نہیں ہونے دیں گے۔ اس پندرہ بیس اشخاص کی ٹولی میں چند نام تو آپ کے بھی ذہنوں میں ہوں گے۔ پروفیسر محمد مجیب ڈاکٹر عابد حسین، شفیق الرحمن قدوائی صاحب جو کہ ڈاکٹر قدوائی کے خالہ زاد بھائی تھے جو بعد کو جامعہ کے بڑے سرگرم رکن رہے ؛ حامد علی خاں صاحب، مکتبہ جامعہ کے مینیجر اور چند اور استاد اور شاگرد! بہرحال جامعہ بند نہ ہوئی اور ہم لوگ مکانوں اور گھروں کو واپس نہ کئے گئے۔ تو، کہہ میں یہ رہا تھا کہ یہ ذاکر صاحب اور جامعہ کے تمام اساتذہ کے اخلاص کا زمانہ تھا ؛ عزم کا زمانہ تھا، اخلاص کا زمانہ تھا، تنظیم، عمل اور کام کا زمانہ تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کہیں بھی جائیے، کسی کے مکان پر جائیے، ہمارے بورڈنگ کے وارڈن ارشاد الحق صاحب تھے، میں ان کے کمرے میں لٹکا دیکھتا تھا، ذاکر صاحب کے کمرے میں لگا دیکھتا تھا : یہ اقبالؔ کا ایک شعر تھا، جو اُس عہد کے بڑے اچھے کاتب رستم قلم علی محمد خاں صاحب فرخ آبادی کا جو جامعہ کے اسٹاف میں تھے، لکھا ہوا تھا، جس کو طبع کیا گیا تھا۔ اس وقت اُردو ہی نہیں آتی تھی، فارسی کیا آتی۔ لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اچھی شاعری وہ شاعری ہے جو کسی زندہ تحریک میں تبدیل ہو جائے۔ اس کے اثرات ایسے ذہن پر بھی مرتب ہو سکتے ہیں جو زبان کی پوری تفہیم نہ کرتا ہو، لیکن ایک دو لفظ یہاں وہاں سے چمک جائے تو وہ نشتر بن کر اس کے دل میں اُتر جاتا ہے۔ وہ شعر یہ تھا :

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم ⁘ از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

تو اس میں تخلیق مقاصد، آرزو، زندہ یہ چند لفظ تھے جس سے کہ مجھے آج محسوس ہوتا ہے کہ میں اس وقت بھی اس شعر کی جو اسپرٹ ہے، جو روح ہے اُس کو سمجھ رہا تھا، گو کہ میں فارسی بالکل نہیں جانتا تھا۔ اُس وقت میری عمر ہی کیا تھی۔ اور یہ شعر گنگناتے تھے ہم لوگ اور یہ سمجھتے تھے کہ ہم

اس کے اثر کو پڑھ رہے ہیں! ایک اور تختی جو کہ ہر جگہ ہمیں ان کے دست قلم کی لکھی ہوئی ملتی تھی اس سے بھی جامعہ کی اس ٹولی کے عزم کا پتا چلتا۔ شفیق صاحب کے یہاں جایئے اُن کے یہاں لکھا ہوا ملے گا، مکتبہ میں جایئے وہاں بھی یہ ٹنگا ہوا ملے گا، وہ حالی کا یہ قطعہ تھا:

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو ۔۔۔ ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا ۔۔۔ ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

اِس رباعی اور اس شعر کے اندر جامعہ کی وہ جو ۱۵، ۲۰ پر مشتمل سر سے کفن باندھے ہوئے ٹولی تھی، اس کے عزم کا اور جامعہ کے اس طریقے سے ایک بڑے بے سرو سامانی کے وقت سے نکل جانے کا پورا اثر ملتا ہے اور ہر شخص اس قسم کے جذبات اور خیالات سے سرشار تھا۔

یہی افلاس کا دور تھا جب ذاکر صاحب کا حِسِّ مزاح (Sense of Humour) بروئے کار آتا تھا۔ ذاکر صاحب کو اپنی آخری عمر میں کچھ صحت کی خرابی کی وجہ سے کچھ اس کڑھن کی وجہ سے جو سن ۷۰ کے واقعات سے تھی، جامعہ پہ جو افتاد گزری علی گڑھ کے حالات سے ہر طرف کے طعن و تشنیع سے جس کا شکار ظاہر ہے کہ کسی بھی بھلے آدمی کو ہونا پڑتا ہے، وہ کافی جھول سے گئے تھے؛ ڈھل گئے تھے۔ لیکن یہ زمانہ تھا جب، میں نے دیکھا ہے کہ، اُن کے ہاں مزاح اور ٹھٹھول بہت ہی شائستہ قسم کا مزاح، بات بات سے ٹپکتا تھا۔ وہ بہت اچھے کنورسیشنلسٹ (Conversationalist) تھے، مقرر تو تھے ہی، آپ نے سنا ہوگا، لیکن ان کی ٹیبل ٹاکس (Tabil talks) اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہوتی تھیں اور وہ اپنے مخصوص حلقوں میں جب کھلتے تھے تو واقعی ان کی زبان سے پھول جھڑتے تھے اور ہم لوگوں کو رشک ہوتا تھا تو یہی زمانہ اُنکے حسِ مزاح کے کمال کا ہے، وہ مجلس میں، دوستوں میں، رشتہ داروں میں، عزیزوں میں چہکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سارا دباؤ اور تناؤ جو جامعہ کی مالی پریشانی کی وجہ سے، یا ایک نئے ادارے کو تنظیم دینے کی وجہ سے ان کے ذہن پر دن بھر میں رہتا تھا وہ گفتگوؤں میں اس کو خرچ کر دیتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گھر میں یہ حال تھا کہ اگر ایک یا دو مہمان کسی وقت ٹپک پڑیں تو بیگم صاحبہ، بیگم ذاکر حسین جن سے کہ اُن کی ہمیشہ چھیڑ چھاڑ رہتی تھی، ان کے پاس واحد ترکیب یہ تھی کہ سالن جو پکا ہو اس میں ایک لوٹا پانی اور ڈال کے اور تھوڑا سا نمک ڈال کے، اس کو ذرا سا بڑھا دیا۔ یہ ترکیب "ہتکنڈے"

وہ ہیں جو ایک گھریلو عورت کو کرنا پڑتے ہیں اور بھی واقف ہیں؛ جو اس دور سے گزر چکے ہیں، وہیں سب کو کرنا پڑتے ہیں؛ ان کو اکثر کرنا پڑتے تھے۔ چنانچہ جب وہ سالن بڑی قاب میں، جس میں کہ شوربا ہی شوربا ہوتا تھا، بھر کر دیا جاتا تھا اور باہر آتا تھا تو جو کوئی مہمان ہوئے، میں بھی موجود ہوا تو فوراً مجھ سے کہتے: میاں مسعود! لانا میرا لنگوٹ! باندھ کر ماروں غوطہ، اِدھر سے اُدھر نکل جاؤں اور اُدھر سے اِدھر نکل جاؤں!!

اتفاق سے گھر میں چھبّو نام کا ایک چھوٹا سا لڑکا بھی تھا، دس بارہ برس کا۔ وہ فوراً وہاں سے جاتا، اور بیگم صاحبہ کے کان میں ڈال دیتا کہ صاحب یہ کہہ رہے ہیں۔ پھر مہمان تو چلا جاتا، اب جو یہ اندر گئے تو مسکرا رہے ہیں ـــــ اور وہ ہو رہی گرم! کیا میرا مذاق اڑایا جاتا ہے، اور یہ ہے اور وہ ہے۔ خیر بات آئی گئی ہو جاتی!

یہی زمانہ ہے جب لوگ یہ عجیب و غریب چیز ہے، کہ ان کی فیاضی اور دوسروں کو مدد کرنے کی، مالی مدد کرنے کی حِس اس زمانے میں میں نے زیادہ پائی، بہ نسبت کسی اور زمانے کے جبکہ وہ خوشحال تھے۔ اس زمانے میں یہ اکثر ہوا ہے کہ کئی برس کے انتظار کے بعد نیا لحاف یا نیا گدا، جڑاول بنائی گئی اور بعد کو معلوم ہوا کہ ایک دن وہ جڑاول ابھی سردیاں آئی بھی نہیں پائی تھیں، اس کا استعمال بھی نہیں شروع ہوا تھا کہ گھر سے غائب ہو گئی۔ تمام شور مچ رہا ہے، کون لے گیا، کہاں لے گیا، تو معلوم ہوا انھوں نے کسی غریب طالب علم کو جو سردی میں اکڑ رہا تھا یا کسی اور غریب ساتھی کو اُڑھا دی ـــــ اور خود اپنے پرانے لحاف میں، گدے میں پڑے رہتے تھے!

مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک دفعہ جب جڑاول غائب ہو گئی، میں شام کو پہنچا تو ہماری چچی صاحبہ واویلا کر رہی تھیں کہ انھیں کیا ہو گیا ہے ـــــ خواتین انھیں ہی کہتی ہیں ـــــ "انھیں کیا ہو گیا ہے، ابھی میں نے بنایا تھا، خود اپنا لحاف پرانا ہو گیا ہے اور کسی طالب علم کو دیدیا، پھر اللہ سے یا کہاں سے آیا تھا، سردی کے کپڑے نہیں تھے۔ اس پر انھوں نے جو لطیفہ سنایا مشہور فلسفی کانٹ کا، اس لطیفے سے میں تو محظوظ ہوا، اگرچہ میرے خیال میں چچی صاحبہ پہ کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ اُنھوں نے کہا "کانٹ" ہر سال سردیوں میں یہ خیال کرتا تھا کہ میں اپنا پرانا اوورکوٹ ابکی الگ کر دوں گا، نیا اوورکوٹ خریدوں گا۔ اور اس کے لئے کچھ پیسے سال میں بچاتا رہتا تھا۔ اور جب اُس کی عمر ۳۰ سے تجاوز کر گئی تو ہر سال وہ یہ کہتا تھا کہ ابکی کرسمس کے موقع پر میں شادی کر لوں گا۔ اور اس کے لئے وہ پیسے بچانا شروع کرتا تھا۔

شادی کا منصوبہ اس نے اپنی زندگی میں کئی بار بنایا اور، اس کے بعد جب پیسے اتنے ہو جاتے تھے اور سردیاں آتیں تو کہتا تھا، میرا اُوور کوٹ جو بے پرانا ہو گیا ہے، شادی تو اگلے سال میں ہو جائے گی اس کا بدلنا ضروری ہے؛ انھیں پیسوں سے وہ اُوورکوٹ اور گرم سوٹ وغیرہ بنا لیتا تھا اور شادی اس طریقے سے ملتی رہتی تھی۔

یہ لطیفہ سنا کر اپنی بیگم سے بولے کہ بھئی میں یہ تو نہیں کرتا ہوں، خدا کا شکر ادا کرو، شادی تو نہیں کرتا ہوں۔ میں صرف یہی کرتا ہوں۔ یہ کر بیٹھوں تو کیا کرو گی۔

غرضکہ حسِ مزاح (Sense of humour) میں زندگی کے وہ نشتر، وہ چھوٹی چھوٹی تلخیاں جو بعض اوقات گھریلو زندگی میں بڑھ جاتی ہیں، انھیں وہ نہ صرف خود گوارا کر لیتے تھے، بلکہ دوسروں کے لئے گوارا بنا دیا کرتے تھے۔

جامعہ کی جو خدمات کی ہیں اور کڑے وقت میں جس قربانی کے ساتھ انھوں نے جامعہ کو چلایا ہے اس کی تفصیلات میں، میں نہیں جاؤں گا لیکن، اس زمانے میں جو جامعہ برادری کہلاتی تھی اس میں جو ان کے چلنے پھرنے کا ڈھنگ تھا، برتاؤ تھا، سلوک تھا اس کی ایک دو یادیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

جامعہ ملیہ واقعی ایک سرپھروں کا مجمع تھی۔ ذاکر صاحب کی قیادت میں ان سرپھروں میں سے کسی کو یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ہم جامعہ کے لئے اسی قدر مفید نہیں ہیں، یا قربانی نہیں کر رہے ہیں جتنی کہ ذاکر صاحب کر رہے ہیں اور ذاکر صاحب انھیں باور کراتے رہتے تھے کہ بھئی میں تو صرف منتظم ہوں، دیکھتا ہوں اصل قربانیاں تو آپ کی ہیں۔ آپ اس ادارے کو چلا رہے ہیں۔ انھیں آدمی سے کام لینے کا گُر آتا تھا، اس کی تعریف کرتے تھے، اس کے کاموں کی تحسین کرتے تھے اور اسے کام کرنے کے لئے گرما دیتے تھے۔ کسی کے ہاں کھانے کا انتظام نہیں ہے تو ڈائننگ ہال سے کھانا جاری کروا دیا، وہاں تھوڑے سے پیسے میں کام چل جاتا تھا۔ اس طریقے سے وہ مختلف لوگوں کی جو ضروریات ہیں ان کو پورا کرانے کی کوشش کرتے تھے۔ کہیں نہ کہیں سے کچھ دلوا دیا، کچھ کام دلوا دیا۔

اس انداز کی قیادت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذاکر صاحب کے زمانے کے ایک چپراسی جو کہ اتفاق سے جب میں ابھی جامعہ میں شیخ الجامعہ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، تو وہ میرے اُوپر مسلط تھے یعنی میری پیشی میں تھے، ان کے ریٹائرمنٹ کا وقت آ گیا تھا۔ لیکن وہ ریٹائر ہونے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔

وہ کہتے تھے کہ ذاکر صاحب کی جامعہ میں کوئی شخص ریٹائر ہوتا ہی نہیں تھا، مرجائے، گم ہوجائے، کچھ اور ہوجائے، یا خود کسی مجبوری سے چلا جائے ـــــ ورنہ وہاں ریٹائرمنٹ کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اس لئے کہ یہ تو سب قربانی کرنے والوں، ایثار کرنے والوں کا مجمع تھا! یہ آپ مجھے ریٹائر کیسے کررہے ہیں۔ میں نے کہا ابھی جامعہ کے رول بدل چکے ہیں، وہ جامعہ سرکاری مدد نہیں لیتی تھی، اب ہم سرکاری مدد لیتے ہیں، ہمیں کچھ ریٹائرمنٹ کے رول بنانے پڑتے ہیں، اس کے مطابق آپ کو ایک ایک سال کی تین توسیعات دی جا چکی ہیں، اب کہاں تک دی جائیں گی! اور آپ کی عمر پہلے سے میں نے معلوم کر لیا، پانچ سال کم ہے! تو تین توسیعات اور پانچ سال آپ نے عمر کم [illegible] ساٹھ کے بعد آپ نے آٹھ سال سروس کرلی ہے، اڑسٹھ برس کے ہو گئے، اب آپ آرام فرمائیے! بہت ناراض ہوئے!! ایک دن میرے سکریٹری سے کہنے لگے کہ صاحب ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے جامعہ کیوں نہ چھوڑ دی۔ بہت پہلے ہی ہمیں چھوڑ دینا چاہئے تھی، دیکھئے جامعہ سے جو بھی نکل گیا وہ کچھ نہ کچھ بن گیا! ذاکر صاحب نکلے، وائس چانسلر ہو گئے، گورنر ہو گئے، صدر جمہوریہ ہو گئے۔ فلاں صاحب نکلے فلاں جگہ جاکے پروفیسر ہو گئے! ہم بھی اگر اس وقت نکل جاتے تو آج کچھ ہو جاتے۔ یہ سن کر میں ہنسا۔ مجھے ان کی نفسیات معلوم تھی۔ یہ شروع سے اس جامعہ برادری کے فرد تھے جس میں ہر شخص برابر تھا اور کوئی شخص زیادہ برابر (more equal) نہیں تھا۔ ہر شخص برابر تھا، ہر شخص دوسرے کو ٹوک دیتا تھا۔ چپراسی ہو، کلرک ہو، نیا استاد ہو، جب مجلس شوریٰ ہوتی تھی تو ہر شخص شیخ الجامعہ سے یا دوسرے کسی عہدیدار سے، خازن سے، برابری کی گفتگو کرتا تھا اور اپنی تجاویز پہ اٹھ کے واک آؤٹ (walk out) بھی کر جاتا تھا۔ یہ تمام تماشے ہوتے رہتے تھے۔ ذاکر صاحب نے اسے انگیز کیا۔ یہاں ایک جمہوری نظام تھا جہاں پہ ہر چھوٹے بڑے کی رائے کا احترام کیا جاتا تھا اور ہر ایک کو اپنی بات کہنے کی جرأت ہوتی تھی۔ ذاکر صاحب کہتے تھے کہ ان لوگوں کو خفا ہونے دو، میں مناؤں گا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ہر مہینے ایک نہ ایک استاد یا ایک کلرک ان سے خفا ہو جاتا تھا اور پھر وہ تاسف یا افسوس ظاہر کرنے کے لئے نہیں آتا تھا، ذاکر صاحب اس کے مکان پر دوسرے یا تیسرے دن پہنچتے تھے اور اظہار افسوس کرتے تھے اور پھر تعلقات قائم ہو جاتے تھے۔

جب وہ شیخ الجامعہ تھے، ذاکر صاحب کے ایک پرسنل اسسٹنٹ تھے الیاس مجیبی مرحوم، جنھوں نے کہ ”سرکار دو عالم“ ”سرکار کا دربار“ اور بہت سی کتابیں لکھی ہیں، بچوں کے ادیب کہلاتے تھے، سکریٹری تو وہ نام کے تھے، ادیب زیادہ تھے، سارا وقت ان ہی چیزوں میں صرف کرتے تھے۔ خط و کتابت اور

مراسلت کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ کام پڑا رہتا تھا اور ہمیشہ ذاکر صاحب ان سے شاکی رہتے تھے۔ لیکن ان سے خفا ہونے کی ان میں ہمت نہیں تھی اس لئے کہ وہ برابر کے مشیر تھے؛ سکریٹری یا اسسٹنٹ نہیں، مشیر تھے؛ اور مشیر اوّل کی حیثیت سے ذاکر صاحب کو اُن کی رائے کا احترام کرنا ضروری تھا۔ زیادہ سے زیادہ جب بہت تنگ آجاتے وہاں سے لوٹ کر ذکر آتا تو، کہتے تھے بھئی ہماری زندگی، ہماری تخلیق کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم الیاس مجیبی صاحب کے بنھائیں: بس ہمارا دنیا میں اور کوئی مقصد نہیں! اس سے آگے کبھی اُنھوں نے ان کی شکایت نہیں کی۔

اسی طریقے سے ان کے ایک اور عقیدت مند تھے جو دہلی کالج کے پرنسپل تھے۔ چونکہ ذاکر صاحب ۱۹۴۷ء کے بعد دہلی کالج کی گورننگ باڈی کے صدر ہو گئے تھے تو ـــــ اس سے پہلے تو وہ انہیں پہچانتے بھی نہیں تھے لیکن جب وہ گورننگ باڈی کے صدر ہو گئے تو ـــــ اس کے بعد ان کے مکان کی دھول سے ڈالی؛ صبح شام کھڑے ہوئے ہیں۔ ذاکر صاحب کہتے تھے کہ اپنے کالج کے مسائل کم لاتے تھے اپنے مسائل زیادہ لاتے تھے اور عقیدت کا یہ اظہار کہ انھیں فقرا دکھلا کہتے تھے اور جب ذاکر صاحب ڈرائنگ روم سے یا کہیں بیٹھ کے نکل رہے ہیں تو فوراً جسے کہتے ہیں جوتیاں لا کے سیدھی کر دیں؛ ہر قسم کی ایکٹنگ کیا کرتے تھے۔ لیکن ذاکر صاحب میں ضبط و برداشت کا عالم تھا ـــــ اور میں جب ان کی سیرت کے بارے میں کچھ کہوں گا، تو میں بتاؤں گا کہ سب سے بڑی ان کی اخلاقی صفت جو تھی وہ تحمّل تھا، برداشت تھی۔ وہ خود اپنی جان پر عذاب لیتے تھے لیکن دوسروں کے لئے عذاب نہیں بنتے تھے۔ یہ عجیب و غریب چیز تھی! تو، یہ پرنسپل دلی کالج، اتفاق سے پاکستان بننے کے ایک دو سال کے بعد انھیں وہاں کوئی ملازمت مل گئی اور وہ پاکستان چلے گئے۔ جب ذاکر صاحب کو خبر ملی تو مسکرا کے کہنے لگے کہ بھئی ہمیں بھی پاکستان بننے سے ایک فائدہ ہوا کہ خورشید چشتی صاحب سے ہمیں نجات مل گئی! ـ ان کا اس قسم کا انداز تھا! لیکن جب خورشید چشتی صاحب آجاتے تھے تو، تو چل میں چل، بھئی چائے لانا، یہ لانا وہ لانا، اور، وہ جب آتے تھے تو پورے آدھے دن کے لئے آتے تھے۔ اگر دوپہر کو بارہ بجے نمودار ہو جائیں، تو شام کو چھ، سات، آٹھ سے پہلے نہیں جاتے تھے۔ کھانا بھی وہیں، پینا بھی وہیں، مسلط ہو جانے والے آدمی تھے۔

اس تربیت اور اس انداز کی زندگی گزارنے کے بعد مولانا آزاد اور پنڈت

جواہر لال نہرو وغیرہ کے اصرار پر انھوں نے سن ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری قبول کی۔ میں اس وقت وہاں لکچرر استاد کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ کبھی کبھی جب شام کو جانا ہوتا تھا تو مجھ سے پوچھتے تھے کہ بھئی آپ کا یہ علی گڑھ ہے کیسا؟ تو میں ہمیشہ یہ کہتا تھا اور تو کچھ میں نہیں کہہ سکتا ہوں لیکن آپ کی جامعہ سے بالکل مختلف ہے۔ کہنے لگے بھئی ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے کہا آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا، اس لئے کہ آپنے زندگی کے ۲۰ سال ایک ایسے ادارے میں گزارے ہیں۔ جسے آپنے بنایا ہے اور جہاں آپنے قرون اُولیٰ کی جمہوریت قائم کردی ہے جہاں آپ کا چپراسی، آپ کا کلرک، کوئی آداب ملازمت نہیں رکھتا ہے اور با آواز بلند ہر بات کہہ سکتا ہے، ظاہر ہے وہاں پر اپنی جان کھپاتے رہے ہیں آپ۔ کہنے لگے ہاں تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، مجھے زیادہ بات کرنے کی عادت جو ہے وہ بھی جامعہ میں پڑی تھی۔ کہتے تھے وہاں اپنے کلام اور اپنی گفتگو ہی سے تو لوگوں کو آمادہ اور زیادہ آمادہ کرتا تھا! اگر میرے پاس یہ بھی وصف نہ ہوتا، صفت نہ ہوتی، تو لوگوں کو مہمیز کیسے لگاتا! ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا، غلطی وہ کرتے تھے، معافی میں مانگتا تھا! یہاں پر تو بڑے بڑے استاد ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں ایک استاد کے بارے میں، میں آپ کو بتاؤنگا، بغیر نام لئے ہوئے، کہ جب آپنے چارج لیا ہے تو ـــــ مجھ سے ان کے تعلقات ہیں، چونکہ برابر کے آدمی ہیں ـــــ مجھ سے کہنے لگے کہ مسعود صاحب یہ بتایئے کہ ذاکر صاحب کی ہابی (Hobby) کیا ہے؟ میں نے کہا بھئی آپ کو ان کے علم و فضل، کام، سے دلچسپی ہونی چاہیئے! ہابی سے کیا دلچسپی ہے؟ جب وہ چلے گئے تو ہمارے ایک اور دوست جو بیٹھے ہوئے تھے، کہنے لگے کہ یہ ہابی کے ذریعہ سے داخل ہونا چاہتے ہیں۔ خیر، میں نے تو مذاق میں ان سے کہا کہ ان کی ہابی جو ہے وہ صرف گلاب ہے۔ مگر بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے کسی اور سے ان کی ہابی گلاب کی معلوم کرلی اور گلابوں کے نئے نئے قسم کے پودے لے کر انھوں نے رسوخ حاصل کرلیا۔ ایک دن جب ذاکر صاحب شام کو اپنے گلابوں میں ٹہل رہے تھے تو کہنے لگے بھئی دیکھئے یہ گلاب کی قسم، اس کا رنگ تم نے دیکھا ہے! یہ ہیں فلاں صاحب نے لاکر دیا ہے۔ یہ کہہ کر کہ میں بنگلور گیا تھا وہاں سے یہ لایا ہوں۔ میں نے کہا تو ہاں وہ ایک دن آپ کی ہابی مجھ سے پوچھ رہے تھے تو میں نے گلاب کا پتا نہیں دیا لیکن اتا پتا انہیں مل گیا ـــ کہنے لگے بھئی عجیب و غریب دنیا ہے۔ میں نے کہا دیکھئے صاحب، یہاں پر آپ کو

ایڈمنسٹریٹر بنتا ہے۔ ایڈمنسٹریشن میں اور تالیف قلب میں، بھائی چارے میں میاں بھائی کہکر بات کرنے میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔! یہ بڑا ادارہ ہے، اس کی روایات بن چکی ہیں، یہاں لوگ جو ہیں وہ وائس چانسلر کے بٹن کی فکر میں رہتے ہیں کہ کونسا بٹن دبائیں تو کہاں پر کیا پریشر (pressure) پڑے گا۔ یہ وہ ادارہ ہے جہاں ہر ایک اس کے فیس ویلو (Face value) پر جیسا کہ وہ ہے اس کو نہیں لینا ہے۔ بلکہ اس کے بارے میں معلوم کرنا پڑے گا اور کچھ انتظام کرنا پڑے گا۔ کہنے لگے، بھئی یہ کام تو ہم نے کبھی کیا ہی نہیں ہے۔ میں نے کہا جی ہاں کیا تو نہیں ہے مگر علی گڑھ میں جب آپ آئے ہیں تو میں علی گڑھ کا طالب علم بھی رہ چکا ہوں، طالب علم تو خیر آپ بھی رہ چکے ہیں، بہت نمایاں طالب علم تھے، لیکن اب بہت عرصہ ہو چکا۔ میں یہاں پچھلے بارہ پندرہ سال سے ملازم بھی ہوں، بحیثیت لکچرر کے، اب وہ نسل علی گڑھ کی نہیں رہی ہے جو اپنے ادارے سے والہانہ محبت رکھتے ہوں یا قربانی و ایثار کا جذبہ رکھتے ہوں۔ نہ یہاں کے سماج یا برادری کی وہ صورت ہے جو جامعہ ملیہ کی ہے جہاں پر ہر شخص اپنے آپ کو سمجھتا ہے کہ میں معمار اعظم ہوں اس جامعہ ملیہ کا! چنانچہ رشید صاحب نے ذاکر صاحب پر جو مضامین لکھے ہیں ان میں ایک بڑا اچھا جملہ لکھا ہے کہ میں جب جامعہ ملیہ جاتا ہوں، یہ انھیں کے الفاظ میں، تو مجھے جتنا شیخ الجامعہ سے ڈر لگتا ہے اتنا ہی مجھے چپراسی سے ڈر لگتا ہے اس لئے کہ دونوں خادمِ قوم ہیں۔ تو رشید صاحب نے بھی اس نکتے کو پا لیا تھا کہ وہاں کی فضا کیا تھی۔

علی گڑھ میں ذاکر صاحب کے مشیر خاص رشید صاحب تھے جن پر کہ وہ پورا بھروسا اور اعتماد کرتے تھے۔ لیکن ایک دن! رشید صاحب میرے استاد بھی رہے تھے، میں نے ایم۔اے اُردو میں کیا تھا۔ ایک دن اچانک مجھ سے کہنے لگے کہ بھئی آپ کے استاد، یعنی رشید صاحب، کا واقعات کی طرف اخلاقی ردِ عمل تو بہت صحیح ہوتا ہے لیکن عقلی اور استدلالی ردِ عمل بہت غلط ہوتا ہے۔

علی گڑھ کے دورانِ قیام، وہاں وہ تقریباً سات سال رہے۔ میں نے مسلسل دیکھا کہ کھانے اور ناشتے کی میز پر کھیل کے میدان میں جوان کا اسٹیمیٹ (estimate)، اور ان کی جو میزان ہے ہر شخص کے لئے، ہر استاد اور اہم شخصیت کے لئے بڑی صحیح ہوتی تھی، اور ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان سے زیادہ مردم شناس وائس چانسلر علی گڑھ کو کبھی نہیں ملا: جو استادوں کے کاموں کو جانتا ہے، استادوں کی صلاحیت کو جانتا ہے، یہ جانتا ہے کہ کون سا استاد جو ہے وہ گپ کر رہا ہے، کونسا! لیکن مجھے بھی جب میں ذاکر صاحب پر کچھ لکھوں تو باوجود قرابت داری کے اس کا ذکر کرنا چاہئے: ـــــ اور ـــــ میں ہی نہیں بلکہ

بیشتر وہ لوگ جو اس زمانے میں ان کے قریب آئے اور انھیں کام کرتے ہوئے دیکھا اس بات پر متفق ہیں کہ ـــ علی گڑھ میں غلط آدمیوں نے ان سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ اور، جو اچھے لوگ تھے اپنے کام سے کام رکھتے تھے، صحیح معنوں میں علم سے محبت رکھتے تھے، وہ اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ خود ان کی نظر کبھی پڑ جاتی تھی تو وہ کھینچ کر اُسے باہر لانے کی کوشش کرتے تھے لیکن چونکہ وہ زیادہ گھستے نہیں تھے، لہٰذا علی گڑھ میں جہاں اچھے آدمیوں کو فائدہ پہنچا، اس سے زیادہ غلط آدمیوں کو ترقیاں ملیں، اور جس سے نقصان پہنچا۔

میں، تھوڑا سا! میں نے آپ کو بتایا کہ میرا اُن کا رشتہ، قرابت داری کا نہیں تھا، بلکہ گھر کے بچے کی حیثیت سے قریب رہنے کا جو تھا، تنہائی میں، میں ان سے خاصی کھلی گفتگو کر لیتا تھا۔ میں ان سے ہمیشہ کہتا تھا کہ صاحب علی گڑھ کو آپ اس انداز سے نہ چلایئے جس انداز سے کہ جامعہ ملیہ چلائی ہے۔ کہنے لگے میں کیا کرتا ہوں؟ میں نے کہا کہ آج ہی میں نے دیکھا کہ آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے فلاں صاحب سے دو گھنٹے تک تقریر کر رہے تھے اور سمجھا رہے تھے اور نکتہ صرف یہ تھا کہ وہ آپ کے پاس کوئی کام لے کر آئے تھے اور آپ نے معذرت کر لی تھی کہ بھئی یہ قاعدے قانون کے مطابق میں کر نہیں سکوں گا، اور پھر تالیفِ قلب کے لئے دو گھنٹے اس پر صرف کئے کہ کیوں نہیں کر سکوں گا۔ تو کہنے لگے واہ، یہ کوئی بات ہوئی کہ آپ انکار بھی کر دیں اور پھر بیچارے کی تالیفِ قلب بھی نہ کریں، میں نے کہا آپ کی صحت اس قابل نہیں ہے ـــــ کیونکہ علی گڑھ کے پہلے ہی سال ۴۹ء میں قلب کا پہلا حملہ ہوا تھا، اور اس کے بعد سے وہ ظاہر ہے کہ ہمیشہ مبتلا ہو گئے تھے۔ اسٹرین (strain) کچھ نہ کچھ پڑتا ہی رہتا ـــــــ نہ تو جتنی نقطۂ نظر ہے، نہ تضیع اوقات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جو ہوتا ہے؟ کیوں آخر آپ! آپ بتا دیجئے، آپ تو بڑی نرمی کے ساتھ ملائمت کے ساتھ بات کرتے ہیں، کہ میں نہیں کر سکتا ہوں۔ تو آپ مطمئن کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟ دیکھئے، انسان کی فطرت ہے، اور علی گڑھ کے انسانوں کی فطرت کو میں جانتا ہوں کہ آپ دو گھنٹے تک persuade کرنے کی کوشش کریں اس کے لئے کہ آپ کا فیصلہ صحیح ہے، لیکن باہر وہ غیر مطمئن ہی جائے گا، وہ تو مطمئن اس وقت ہوگا جب کہ اس کا غلط کام کر دیا جائے تو اس طریقے سے انرجی ضائع کرنے کی (کیا ضرورت ہے) کہ وہ الجھتا ہے بحث کرتا ہے، آپ اس کا جواب دیتے ہیں، آپ کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔

ان کا انداز یہ تھا کہ جب کوئی بات ان کے دل میں اترتی تھی تو خاموش ہو جاتے تھے، سوچتے

لگے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بات آپ کہہ رہے ہیں وہ ان کے دل میں اُتر رہی ہے۔ کہنے لگے: مجھے تو عادت ہے 'جامعہ سے' اور میں نے تو زندگی اسی طریقے سے گزاری ہے کہ لوگ مجھے بُرا بھلا کہتے ہیں میں ان سے معافیاں مانگتا ہوں۔ میں نے کہا صاحب' یہاں تو جامعہ سے دس گنا بیس گنا زیادہ اسٹاف ہے۔ یہاں کس کس کے گھر جائیں گے اور معافی مانگیں گے۔ وہاں ایک تیس چالیس، پچاس آدمی ہیں' اس میں دس بیس خراب آگئے' تو آپ یہ کر سکتے تھے!

علی گڑھ میں انھیں دیکھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ جتنا ضبط و تحمل ان کے پاس تھا وہ واقعی بہت کم لوگوں کے پاس ہوگا اور، غالباً، یہ صرف ان ہی کے پاس نہیں تھا۔ یہ کرداری خصوصیت اس پوری نسل کی تھی جس نے قومی آزادی کی لڑائی لڑی تھی۔ گاندھی جی کے بارے میں بھی اسی قسم کے واقعات اور روایتیں سُننے اور پڑھنے میں آئی ہیں۔ وہ ہر چیز سُنتے تھے اور اپنے اُوپر سہہ لیتے تھے، دوسرے کو تکلیف یا گزند یا دُور سے بھی کوئی ٹھیس پہنچانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

ظاہر ہے یہ یادوں کا جو سلسلہ ہے ایک لکچر نہیں پوری ایک تصویر کا موضوع بن سکتا ہے۔ میں اس وقت زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا، یہ تو واقعات تھے جن سے کہ میں نے ان کی قلمی تصویر کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ہے ان کی شخصیت کے بارے میں میرے تاثرات، ان کے بارے میں چند کلمات اور کہنا چاہتا ہوں:

میرا خیال یہ ہے کہ شخصیت کے جو تین بنیادی فلسفیانہ عناصر ہیں، خیر، صداقت اور حُسن، ان کی شخصیت ان تینوں سے عبارت تھی۔ آخری عمر میں ان کا رجحان مذہب کی طرف ہوگیا تھا' ویسے وہ مذہب کے خلاف کبھی بھی نہیں رہے۔ اور، اسلام کی جو بھی عبادات ہیں اس میں حسب توفیق حصّہ بھی لیتے رہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ ایک اخلاقی آدمی —— تھے اگر کوئی مذہب یا مذہبی شخص اخلاقی اقدار کی پابندی نہیں رکھتا تو اس کا مذہب اور ساری عبادتیں اور ریاضتیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ یہ اخلاقیات یا اخلاقی اقدار یا خیر یہ تو میں نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ماخذ یا سوتے انھوں نے کہاں سے لئے تھے۔ لیکن دو سوتوں کا میں قیاس کر سکتا ہوں —— ایک تو قائم گنج کا وہ

پٹھانی سماج جس کے یہاں اخلاقی قدر ہوتی ہے تو راسخ ہوتی ہے ــــــ اور بداخلاقی قدر ہوتی ہے، تو وہ بھی راسخ ہوتی ہے ــــــ لیکن ہوتی راسخ ہے! تو، کچھ اقدار تو وہاں سے انھیں ملی تھیں' ندشے کی اقدار! بات کا پاس ہے، دوسرے کی مدد کرنا نیکی، دوسرے کا احترام اپنے احترام کے ساتھ؛ یہ قبائلی اور سماجی وراثت کے طور پہ ملیں۔

لیکن غالباً جب وہ جرمنی میں تھے اس وقت کی فکر میں کئی ایسے فلسفی پیرس میں، برلن میں، انگلستان میں موجود تھے جو اخلاقی اقدار کو ایک طریقے سے مذہبی عبادات اور رسومات سے بھی برتر مانتے تھے کہ اگر اس کے بغیر مذہب ہے تو کچھ نہیں ہے۔ بعض لوگ تو خیر، مذہب کو مانتے ہی نہیں تھے' اخلاق کو ہی مذہب مانتے تھے۔ لیکن کچھ لوگ جو کہ کرسچینٹی کے لئے گنجائش نکال لیتے تھے، وہ بھی اس التزام و ملزوم کے ساتھ کہ کوئی مذہبی شخصیت بغیر اخلاق کے لائقِ اعتبار نہیں ہے۔ چنانچہ ایسی مذہبی شخصیتیں جن کا ظاہر ہر اعتبار سے بہت مذہبی ہے اگر وہ بداخلاقی کی حد تک گرتے تو اس وقت انھیں جلال آ جاتا تھا، غصہ آتا تھا۔ صحیح غصہ ذاکر صاحب کا، لوگوں نے بہت کم دیکھا ہے' وہ ہمیشہ آیا ہو کسی اخلاقی قدر پر! اس وقت وہ بے آپے ہو جاتے تھے اور چہرہ سرخ ہو جاتا تھا اور شستہ زبان میں جتنے سخت کلمات وہ کہہ سکتے تھے کہہ دیتے تھے۔

گو کہ تھوڑا سا تصوف کی طرف بھی رجحان تھا، ابتدائی زندگی میں اس کے سرچشمے ملتے ہیں۔ مگر وہ تصوف بھی جو کہ اخلاق سے عاری ہو ان کے لئے قابلِ تقلید نہ تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی چند اخلاقی قدروں کے گرد بنائی تھی۔ وہ اخلاقی قدریں کچھ تو انھیں خود مذہبِ اسلام میں ہی مل گئی تھیں؛ کچھ انسانیت دوستی کی تحریک میں مل گئی تھیں جس سے کہ یورپ کی فضا معمور تھی؛ اور کچھ ان عملی اقدار میں مل گئی تھیں جن سے کہ ہماری قومی تحریک عبارت تھی۔

اسی ضمن میں، میں یہ بھی آپ کو بتادوں کہ جن شخصیتوں نے ذاکر صاحب کو سب سے زیادہ متاثر کیا: ایک تو گاندھی جی کی شخصیت تھی۔ میں نے کبھی انھیں گاندھی جی پر تنقید کرتے نہیں سنا، بجز ایک موقع کے؛ اور، اس کا پس منظر کیا تھا میں نہیں کہہ سکتا ہوں۔ گاندھی جی پہ بات ہو رہی تھی کہ ان کی زبان سے نکلا کہ "آخر لوگ سیاست سے رٹائر کیوں نہیں ہو جاتے ہیں۔ رٹائر ہونا کیوں نہیں چاہتے ہیں"! گاندھی جی کی طرف اشارہ تھا۔ اب مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ کس سلسلے کا یہ موضوع تھا۔ میں ایک دم تھوڑا سا چونکا ہوگیا،

اور میرے ذہن پر یہ جملہ اب تک مرتسم ہے۔

دوسری بڑی شخصیت جس سے کہ وہ متاثر تھے اور جوان کی ذہنی ساخت کے بہت قریب تھی وہ اقبالؔ کی شخصیت تھی۔ اقبالؔ کا جادو سر پر بہت پہلے چڑھ گیا تھا، نہ صرف ذاکر صاحب پر، بلکہ مولانا محمد علی پر! یہ عجیب و غریب چیز ہے کہ اقبال کی بانگ درا ابھی شائع بھی نہیں ہوئی تھی صرف اسرار خودی ہی شائع ہوئی ہے اور رموز بیخودی : پہلی جنگ عظیم سے پہلے ١٩١١ء اور ١٩١٢ء میں، اگر تاریخیں مجھے صحیح یاد ہیں۔ اسرار خودی کے شائع ہوتے ہی مولانا محمد علی کو تو ایک صحیفۂ آسمانی مل گیا تھا۔ اس کے اشعار پڑھتے جاتے تھے اور آنسو بہتے جاتے تھے — ابتدائی جامعہ ملیہ میں جب وہ علی گڑھ میں درس دیا کرتے تھے — وہ پہلے شیخ الجامعہ بھی تھے — تو اُن کا درس ایک دن اگر قرآن کریم پر ہوتا تھا تو دوسرے دن اقبال پر، جو اسلام کا exposition ہے اس پر۔ (جن لوگوں نے یہ درس سنے ہیں ان پر جو کیفیت طاری ہوتی تھی (وہی جانتے ہیں)' ذاکر صاحب کا اقبالؔ کے ساتھ جو غلو و شغف ہے (اس کا یہ پس منظر ہے)، اُنہیں اقبالؔ کے اشعار بے شمار یاد تھے۔ اچھے اشعار رستم قلم محمد علی فرخ آبادی کو جو جامعہ میں خوش نویسی کے استاد تھے، وہی چھانٹ کر دیا کرتے تھے! ان سے لکھواتے تھے۔ پھر مکتبہ جامعہ انھیں اہتمام کے ساتھ شائع کرتا تھا اور جگہ جگہ جاتے تھے۔ اب میں یہ تو نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اقبال کی فکر سے وہ سو فیصد کہاں تک ہم آہنگ تھے یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ مثلاً اقبال کا جو تصور نسواں ہے ذاکر صاحب اس سے کہاں تک ہم آہنگ ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ انھوں نے کچھ لکھا نہیں ہے اقبال پر، نہ کوئی خاص تقریر یا ہوئی ہے۔ لیکن مجموعی طور سے اقبال کے کلام کا وہ حصہ جو کہ عمل کی آواز دیتا ہے، انسان کی خودی کو بیدار کرتا ہے۔ جو نفس کو مارتا ہے، اوپر لے جاتا ہے اور انسان کو خدا صفت اور خدا نما بنانے کی کوشش کرتا ہے' یہ تمام چیزیں یقیناً ان کے مزاج سے ہم آہنگ تھیں)۔

آخری دور میں جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو اُن کا محبوب بند مسجد قرطبہ کا ایک بند تھا، جسے کہیں دیکھتا تھا کہ شام کو کھانے کے بعد — ان کے سرہانے اس قسم کی کتابیں رکھی رہتی تھیں — ہمیشہ گنگنا کر اسے پڑھا کرتے تھے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ ÷ غالب و کار آفریں، کار کشا کار ساز الخ

یہ اُن کا محبوب بند تھا۔

مجھے یہ معلوم تھا کہ یہ بند انھیں بہت پسند ہے کہ اس میں مردِ مومن یا انسانِ کامل کے نقوش اقبال نے اُبھارے ہیں۔ تو جب ذاکر صاحب نے علی گڑھ کے وائس چانسلری کا چارج لیا، اُس وقت میں شعبۂ اُردو میں لکچرر تھا اور ایک ہوسٹل کا وارڈن بھی تھا۔ وہ ہوسٹل وی ایم ہال میں تھا، جہاں چار پانچ اور ہوسٹل تھے۔ اس کے پرووسٹ صاحب، ڈاکٹر طاہر رضوی، اب بھی حیات ہیں، انھوں نے مجھ سے کہا، مسعود صاحب، ہم نئے وائس چانسلر کو ایک ریسپشن (Reception) دینا چاہتے ہیں جس میں خالی چائے وائے ہی نہ ہو، بلکہ ایک تحریر بھی ہو جو کچھ لکھ کر انھیں دیا جائے۔ اور چونکہ باقی تو سائنس کے لوگ تھے۔ میرے سپرد ہوا کہ آپ لکھ لائیے۔ وہ پریزنٹیشن (Presentation) جو فریم کر کے انھیں دیا گیا تھا اس میں اس بند کے حوالے سے بہت سی چیزیں کہی تھیں اور میں نے بتایا تھا کہ ذاکر صاحب کا کردار اور ان کی سیرت کس طریقے سے اس کا اکتساب کرتی رہی ہے اور کس طریقے سے وہ اس کی جھلک اپنے میں اور اپنی جھلک اس میں دیکھتے رہے ہیں۔

یہ وہاں پڑھ کر سنایا گیا اور بہت بس پڑا۔ جیسے ہوے چور نکل رہے ہیں!! ذاکر صاحب کا چہرہ میں دیکھ رہا تھا کہ: رنگ آ رہا تھا، جا رہا تھا!! اس کے بعد جو کھڑے ہو کر انھوں نے جوابی تقریر کی ہے —— پڑھا ایک طالبعلم تھا، میں تو بیک گراونڈ میں تھا —— تو اس میں انھوں نے بتایا کہ یہ راز بالکل صحیح ہے کہ یہ بند مجھے بہت پسند ہے۔ لیکن میں تو اس بند میں اس شاعرِ اعظم نے جو فکر ظاہر کی ہے اس کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں ہوں۔ اور پھر جو اپنی انکساری اور حلم اور "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک" والے مضمون سے جو انھوں نے شروع کیا ہے، تو! ذاکر صاحب کی بہترین خطابت، بہترین گفتگو اس وقت ہوتی تھی جب آپ چیلنج کرتے تھے!! اگر ان سے اچھی تقریر کروانا ہے تو آپ دکھتی رگ چھیڑ دیجئے۔ وہ اُن کی بہترین تقریروں میں سے ایک تھی۔

شام کو جو میں پہنچا، تو مجھ پر ڈانٹ پڑی کہ حضرت آپ یہ کیا کرتے رہتے ہیں؟ میں نے کہا صاحب میرا کیا تعلق! یہ لڑکوں نے کیا تھا میں تو خود وہاں مہمان کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ نہیں یہ کوئی بتا سکتا ہے، یہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ میں دیکھ رہا تھا آپ کا قلم اس میں! خاصی ناراضگی! اور یہ کہ اس قسم کی چیزوں میں آپ نہ پڑا کیجیے!! خیر وہ بات آئی گئی ہوئی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے فلسفے نے نہ صرف مولانا محمد علی کو، بلکہ ذاکر صاحب، عابد صاحب اس پوری نسل کو متاثر کیا ہے، اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ایک زمانہ تک جب ہماری فکر کے سانچے اقبال نے اپنے قبضے میں کر لئے تھے ـــ یہ نفسیاتی لسانیات کا ایک مسئلہ بھی ہے ـــ اس وقت تو نہیں لیکن اس وقت یہ بات میں زیادہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں ـــ کہ جو بھی نعرے یا تراکیب یا کلیشے (Cliché) کسی بھی تحریک کے لئے ہوں، شاعر تراکیب ایجاد کرتا ہے، نعرہ یا کلیشے استعمال کرتا ہے۔ وہ سب اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ آپ کی ذہنی صلاحیتوں کو از خود سوچنے اور سمجھنے کو ماؤف کر دیتے ہیں۔ شاعر کا طلسم یہی ہے کہ جو بڑا شاعر ہوتا ہے وہ آپ کے ذہن کو اپنی زبان کے سانچے میں پکڑ لیتا ہے۔ اس سے آزاد کرانا، اس سے چھٹکارا پانا ہر شخص کے لئے آسان نہیں ہے۔ اقبال نے بھی ایک نسل کے ذہن کو اپنی تراکیب میں، اپنے مصرعوں میں، اشعار میں، فکر کے سانچوں میں ایسا گرفتار کیا تھا کہ اگر کوئی اس سے ہٹ کر کوئی بات کہتا تھا تو بڑا مشکل ہو جاتا تھا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ ذاکر صاحب مکمل طور سے اقبال کی گرفت میں تھے لیکن اقبال کا اثر ذاکر صاحب پر بہت تھا۔ تیسری شخصیت مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی ہے، جن کی شرافت، نیکی اور دوسری صلاحیتوں سے وہ بہت زیادہ متاثر تھے۔

اب میں زیادہ طول نہیں دوں گا۔ ان کے سلسلہ میں مسجد قرطبہ کا وہی بند جسے کہ وہ اکثر گنگناتے تھے، اسی کے ایک شعر پر میں آج کی گفتگو کو ختم کرنا چاہوں گا، جو ذاکر صاحب کی شخصیت کی پورے طریقے سے ترجمانی اور غمازی کرتا ہے۔ بندۂ مومن کی تعریف کرتے ہوئے اقبال بند میں لکھتے ہیں:

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل ٭ رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

ذاکر صاحب کی شخصیت بھی اسی سے عبارت تھی، جو رزم اور بزم میں دل پاکباز کے ساتھ رہے۔ اور اس کی شہادت میں اس لئے دے سکتا ہوں کہ ایک انسان باہر کے لوگوں کے لئے تو بہت کچھ بڑا انسان نظر آتا ہے، لیکن میں نے ذاکر صاحب کو جیسا باہر دیکھا، مجمع میں دیکھا، ویسا ہی گھر میں دیکھا۔ اور مجھ پر ان کی شخصیت کا سب سے گہرا اثر یہ ہے ـــ میں موضوعی انداز میں آپ سے کہہ رہا ہوں ـــ کہ کوئی شخص چوبیس گھنٹے ایک ہی انداز میں رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پاکبازی اس کی سرشت کا حصہ بن گئی ہے۔ ورنہ آپ نے اکثر دیکھا ہے کہ باہر تو مہاتما اور بزرگ بنے پھرتے ہیں اور گھر میں جائیے تو بیوی بچوں سے، چھوٹوں سے، قرابت داروں سے جو سلوک ہے وہ بالکل دوسرے انداز

کا ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب کا اندر، باہر ایک تھا! اسی لئے پاکباز اور پاکبازی کی ترکیب ان کی شخصیت پر پوری پوری صادق آتی ہے۔ باہر کی شہادت تو آپ لوگ بھی دے سکیں گے، لیکن اندر کا شاہد میں ہوں۔

میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جناب بیدار صاحب کا کہ انھوں نے مجھے موقع دیا ایک ایسے موضوع پر جس پر میں ابھی ختم نہیں ہوا ہوں! ابھی ایک گھنٹہ اور بول سکتا ہوں لیکن آپ کے صبر و تواں ختم ہو چکے ہوں گے! اور ایسے ذی علم حضرات کے سامنے بولنے کا موقع دیا جن میں بہتوں نے ذاکر صاحب کو قریب سے دیکھا ہے اور جو بہت سی باتوں کی تائید کر سکیں گے۔

●●

ڈاکٹر مسعود حسین

گفتگو

(سوال و جواب)

وائس چانسلری چھوڑنے پر : ذاکر صاحب نے جب علیگڑھ کی وائس چانسلری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تو رشید صاحب نے اس وقت جو کچھ کہا وہ دوسرے تیسرے دن جب میری ملاقات ان سے ہوئی تو دوہرایا۔ کہنے لگے : مجھ سے اور ان سے بہت کھل کر گرما گرمی سے بات ہوئی اور میں نے صاف کہدیا کہ جناب آپ یونیورسٹی کو رف ریف کے ہاتھوں میں چھوڑ کر چلے جا رہے ہیں' یہ بہت غلط بات ہے اور میں یہ کہکر اٹھ کر چلا آیا۔ اس دن میں نے زندگی میں پہلی بار ذاکر صاحب پر رشید صاحب کا غصہ دیکھا۔

مولانا آزاد اور ذاکر صاحب : جب ذاکر صاحب وائس چانسلری چھوڑ کے گئے' اس زمانے میں اس کے آس پاس مولانا آزاد نے انھیں بُلایا اور کہا کہ یو جی سی کی چیرمینی خالی ہے' میں چاہتا ہوں کہ اس کو سنبھالو۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں نے اپنی عمر میں پہلی بار بغیر سوچے سمجھے یا اپنی سادہ لوحی سے (ہاں کہدیا)۔ اس کے بعد وہ سمجھے کہ معاملہ طے ہو گیا ہوگا۔ منسٹر آف ایجوکیشن کا کہنا' میرا قبول کرنا' اب صرف formalities میں آفر آئے! کہ : معلوم ہوا دیش مکھ (چیرمین مقرر کر دیے گئے)۔ دیش مکھ کا معاملہ یہ تھا کہ آزاد اور نو جو سیاسی مصالح ہے ہوں' ایک بات جس کا مولانا نے کسی سے ذکر بھی کیا یہ تھی کہ وہ کام بڑا Strenuous ہے اور انہیں ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے' پہلے تو میرا یہی خیال تھا کہ کام چل جائے گا' لیکن بعد میں یہ خیال آیا کہ اس کے لیے ہمیں ایک Administrator چاہیے! مگر انھوں نے ذاکر صاحب سے Consult کیے بغیر (طے کر لیا)۔

ذاکر صاحب کہتے تھے کہ میں نے اپنی پوری عمر میں' ہاں' کہنے کا گناہ صرف ایک بار کیا۔

مولانا آزاد یہ چاہتے تھے کہ وہ آئیں تو انھیں وجہ بتائیں کیوں ایسا کیا۔ لیکن ذاکر صاحب! (پھر نہیں ملے)' پھر ایک دن! ——— ذاکر صاحب نے خود سنایا کہ اجمل خاں صاحب جو مولانا آزاد کے پرائیوٹ سکریٹری تھے وہ ٹیلیفون پر ان کا پیچھا کرتے رہے لیکن ذاکر صاحب نے یہ کہ رکھا تھا کہ کہہ دیجیے گا (کہ کہیں چلے گئے)۔ ایک دن بالآخر اجمل خاں صاحب نے پکڑ لیا : ٹیلی فون ایسے وقت میں کیا کہ انھوں نے خود ہی اٹھایا۔ اجمل خاں صاحب نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب' مولانا آپ سے ملنا چاہتے ہیں' ان کی خواہش ہے کہ آپ ان کے پاس تشریف لائیں۔ بہت عرصے سے مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ آپ سے contact ہی نہیں ہو پاتا تھا۔ آپ کس وقت آسکتے ہیں" ذاکر صاحب نے کہا "مولانا سے کہہ دیجیے گا کہ ان کے گھر کا فاصلہ میرے گھر سے جتنا ہے اسی قدر میرے گھر کا فاصلہ ان کے گھر سے ہے!" اجمل خاں صاحب گھبرا سے گئے' "جی جی جی! کیا مطلب؟" کہنے لگے "میں پھر دوہرا رہا ہوں' میرے یہ الفاظ مولانا سے

آپ کہہ دیجیے گا کہ میرے گھر سے ان کے گھر کا جتنا فاصلہ ہے اُن کے گھر سے میرے گھر کا بھی اُتنا ہی فاصلہ ہے۔" جی
میں ! میں کہہ دوں ! یا ـــ یہ پیغام !" "جی ہاں آپ میرے یہ الفاظ مولانا سے دوہرا دیجیے' یہ میرا جواب ہے۔"
پھر اس کے بعد معلوم نہیں اجمل خاں نے مولانا سے یہ کہا یا مصالح کی بنا پر ! (بچا گئے) بہرحال، ذاکر صاحب
کچھ عرصے کے بعد بغرض علاج جرمنی چلے گئے۔ مغربی جرمنی میں وہ کسی ہسپتال میں داخل تھے کہ انھیں پنڈت جی
کا پیغام (سفارت خانہ کے توسط سے) ملا کہ بہار کی گورنری (قبول کر لیجیے) ۔ یہ بعد کو معلوم ہوا کہ اس میں مولانا
آزاد کا بہت بڑا ہاتھ تھا ؛ وہ کمپنسیٹ (compensate) کرنا چاہتے تھے۔ مگر خود کر ہی نہیں سکتے تھے'
ذاکر صاحب ان سے مل ہی رہے تھے ؛ تو پھر شاید انھوں نے پنڈت جی سے کہا ہو گا ؛ پنڈت جی خود بھی ان کے
قائل تھے۔ پنڈت جی نے ایمبیسڈر (Ambassador) سے کہا کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے ان کی کنسنٹ
(consent) جو ہو ، ہو ؛ لیکن میری طرف سے کہہ دیجیے کہ یہ نہرو کا فیصلہ ہے۔

مذہب کی طرف رویّہ : وہ مذہبی انسان بھی تھے اور آزاد خیال بھی۔ ان کی آزاد خیالی اور
آزاد فکر کے سارے سوتے مذہب میں ہیں۔ اور، آزاد خیالی ان میں اتنی تھی کہ نہ تو ان کی داڑھی اسے چھپا سکتی تھی نہ
شیروانی ۔ مذہب کی جو ریاضتیں ہیں ، عبادات ہیں انھیں وہ ادا کر لیتے تھے لیکن بہت اسٹیڈی (steady)
نہیں تھے ، فجر کی نماز اکثر پڑھ لیتے تھے اس لیے کہ تنہائی ہوتی تھی۔ لیکن فجر کی نماز سے زیادہ وہ مست نظر آتے
تھے جب کوئی انھیں قرآن سناتا تھا۔ چنانچہ جب ان کا ہارٹ فیل ہوا ہے تو اس زمانہ میں ڈاکٹروں کے ساتھ قاری
بھی مسلسل آتے تھے۔ وہ گُپ چُپ لیٹے رہتے تھے۔ ذاکر صاحب کی عربی دانی ایسی تھی کہ وہ قرآن کو سمجھ لیتے تھے'
گو ہر لفظ نہ سہی۔ جب وہ پی۔ایچ۔ڈی کر رہے تھے تو، ایک بیرونی زبان بھی لینی پڑتی ہے' وہ عربی لی تھی۔
ان کے اس وقت کے عربی کے نوٹس میری نظر سے گزرے ہیں۔ قرأت کا اپنا حُسن الگ رہا !

لیکن میرا خیال ہے کہ معتقدات میں بھی وہ خاصے کریٹیکل (critical) تھے ، لیکن مصلحتاً
اظہار نہیں کرتے تھے۔ اس لیے کہ انھیں اس کمیونٹی میں کام کرنا تھا ! وہ خاصا ماڈرن مائنڈ رکھتے تھے بڑے
ریشنل تھے ، میرے خیال میں سرسید سے بھی آگے ! اس لیے کہ سرسید تو پھر بھی ان چیزوں کو ریشنلائز
(Rationalise) کر کے اس ڈھانچے میں لانا چاہتے تھے تاہم ، انھیں ایگناسٹک (Agnostic)
نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال میں وہ مسٹک (mystic) تھے ، اس کی ریاضتوں کے بغیر ! لیکن انھیں چونکہ قیادت
کرنا تھی اس لیے جو کچھ سوچتے تھے ، محسوس کرتے تھے ، اسے کہہ نہیں سکتے تھے ، انھیں بہت کچھ چھپانا پڑتا تھا ، اپنی
پرسنیلٹی کی چھاپ دبی پڑتی تھی !

●●

خورشید عالم خاں

● **جناب خورشید عالم خاں** (پ ۱۹۱۹ء) آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری لی اور امریکا سے مینیجمنٹ کورس کا ڈپلوما؛ ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کالج دہلی کی مجلس انتظامیہ کے وائس چیرمین، آل انڈیا کانگریس کمیٹی (کانگریس آئی) کے اقلیتی شعبہ، دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی اور اُردو ایڈوائزری کمیٹی (دہلی) کے چیرمین اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ، جامعہ ملّیہ اسلامیہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر رہ چکے ہیں۔

۱۹۷۴ء پھر ۱۹۸۰ء میں راجیہ سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔ اسی سال وزارت تجارت (حکومت ہند) کے وزیر مملکت مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۹۸۲ء سے مرکزی حکومت میں سیاحت اور شہری ہوابازی کے وزیر مملکت کے عہدے پر فائز ہیں۔

خورشید صاحب، ذاکر صاحب کے بڑے داماد ہیں۔ ذاکر صاحب سے قرابت داری اس رشتے سے قبل کی ہے، قائم گنج آپ کا بھی وطن ہے۔

●●

ذاکر صاحب کے انتقال پر ان کے دیرینہ ہمدم اور ساتھی پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے"۔ رشید صاحب نے جو عنوان مضمون کا تجویز کیا تھا وہ بذات خود ایک مکمل اور جامع مضمون بن جاتا ہے، اگر ہم ذاکر صاحب کی زندگی اور سیرت پر گہری نظر ڈالیں۔ انہیں کے الفاظ میں "اس حادثہ اور ایسے حادثہ کے بعد اپنی تمام خوبیاں متاع کاسد، اپنے تمام کارنامے بے نور، وہ تمام تعمیریں مسمار، وہ سبز اور شاداب باغ جھلس گیا ہو اور نہریں خشک ہو گئی ہوں اور امید اور حوصلے کے وہ سفینے غرق ہونے لگے ہوں، جن سے کبھی ذہن اور تخیل کی فضا معمور، منور اور معطر تھی۔" یہ واقعہ ہے کہ یہ احساس اور ردعمل نہ صرف رشید صاحب کا تھا بلکہ پورے ملک اور ملت نے کچھ اسی طرح سے محسوس کیا تھا۔ ذاکر صاحب کی بلند نظری، قومی دردمندی اور وسعت قلب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے مخالف بھی جب کبھی ان کی مدد کے خواستگار ہوئے تو انہوں نے بلا پس و پیش بڑے خلوص سے ان کی مدد کی اور کبھی ایسا محسوس نہیں ہونے دیا کہ انہوں نے کسی طرح کا احسان کیا تھا۔

مجھے پھر یہاں پروفیسر رشید احمد صاحب مرحوم کے ایک دوسرے مضمون سے سہارا لینا پڑتا ہے انہوں نے لکھا تھا:

"ذاکر صاحب نے سب سے الگ ہو کر لیکن سب کے لیے جامعہ کی بنیاد ڈالی۔ محنت سہی، بیکسی دیکھی، گالیاں سنیں، رسوائی اٹھائی، انتظار جھیلا۔ لیکن منہ نہ موڑا، مسکرانے سے باز نہ آئے، دشمن سے نہ ڈرے اور نہ اسے دھتکارا، اس نے مانگا تو دیدیا، اس نے چرا لیا تو جانے دیا۔ خود پستے رہے، جامعہ کو بسیرا بنایا، اس کو صرف سنوارا اور انتظار کرنے سے گھبرائے نہیں اس لیے کہ اچھے اور برے کام کرنے میں انتظار کی منزل سرے سے مفقود ہوتی ہے، انجام کا ڈر نہیں ہوتا۔ کام اور انجام ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ انجام یا انعام کا جویا وہ ہوتا ہے جس کو اپنے کام پر نہ ایمان ہو نہ اطمینان۔ سب سے بڑا اور سب سے اچھا انعام وہ ہے جو ہم خود اپنے آپ کو دے سکیں، نہ وہ جو دوسرے سے ملے۔"

ذاکر صاحب کی شخصیت اور کردار کی عکاسی اس سے بہتر الفاظ میں نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک بار جب ذاکر صاحب بغیر وسائل اور کسمپرسی کی حالت میں جامعہ میں اپنی جان کھپا رہے تھے تو ان کے ایک دوست نے بطور مذاق اُن سے کہا تھا کہ ذاکر صاحب جن حالات میں آپ کام کر رہے ہیں اور جامعہ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں لگے ہیں اُس کی مثال تو میں صرف یہ دے سکتا ہوں جیسے ریگستان میں آپ کنواں کھود کر پانی نکالنے کی امید پر زندہ ہوں۔ ذاکر صاحب نے جواب دیا تھا کہ ہاں آپ کو یہی محسوس ہوتا ہوگا کہ میں ریگستان میں کنواں کھود رہا ہوں جہاں پانی نکلنے کی کوئی امید نہیں لیکن مجھے یقین اور اعتماد ہے کہ اس ریگستان سے اپنوں اور غیروں کی آبیاری کے لیے صاف اور شفاف پانی کے گہرے اور نہ سوکھنے والے سوتے پھوٹ نکلیں گے۔

شاید کم لوگوں کو اب یاد ہوگا کہ ۱۹۴۷ء میں جب فرقہ واریت نے تمام ملک کو جھلس دیا تھا اس زمانہ میں ذاکر صاحب کی صحت اچھی نہ تھی اور ڈاکٹر کے مجبور کرنے پر وہ آرام کی خاطر کشمیر کے لیے روانہ ہوئے جالندھر اسٹیشن پر ٹرین روک لی گئی جہاں خونریزی کا جنون انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ بلوائی ذاکر صاحب کو گاڑی سے اُتار کر اسٹیشن سے باہر لے جانا چاہتے تھے لیکن جو لوگ اس وقت اسٹیشن پر موجود تھے۔ انہوں نے بعد میں بتایا کہ ذاکر صاحب موت کی طرف بھی ایسی دلجمعی سے جا رہے تھے جیسے جمہوریہ ہند کے معزز صدر کسی علمی، ثقافتی یا کسی اور اس طرح کی تقریب کا افتتاح کرنے انتہائی بے نیازی کے ساتھ جا رہے ہوں۔

ذاکر صاحب کی زندگی اور شخصیت پر سب سے زیادہ اثر ان کی والدہ اور ان کے محترم استاد سید الطاف حسین کا تھا۔ ذاکر صاحب کی ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کو سنوارنے اور پختہ کرنے میں سید الطاف حسین کی تربیت اور توجہ کا بہت حصہ تھا؛ اور اس بات کا اعتراف ذاکر صاحب نے ہمیشہ بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر شاید باعث دلچسپی ہو۔ ذاکر صاحب نے جب میٹرک کا امتحان دیا تھا اور تعطیلات میں وطن جانے والے تھے تو ایک شام سید الطاف حسین صاحب نے ذاکر صاحب کو اور چند اور طلبا کو کھانے پر بلایا۔ کھانے پر بیٹھنے سے پہلے ان کے استاد محترم نے پیالے میں جو سالن رکھا تھا اس میں کافی ڈھیر سا پانی ملا دیا۔ ظاہر ہے کہ پانی ملے ہوئے سالن سے روٹی دوسرے طالب علم کھا نہ سکے۔ لیکن ذاکر صاحب نے پوری دلجمعی کے ساتھ پیٹ بھر کر کھانا کھایا، جب وہ کھانا ختم کر چکے تو سید الطاف حسین نے فرمایا "ذاکر خدا کا شکر ہے تم امتحان میں پورے اترے اور زندگی میں کوئی کمی یا دشواری تمہیں اداس نہ کر سکے گی۔"

جامعہ نے ۱۹۴۶ء میں جب اپنی زندگی کے ۲۵ سال پورے کیے تو اس کی خدمات کے اعتراف میں

جُبلی کا جشن منایا گیا، اس موقعہ پر چوٹی کے قائدین کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ذاکر صاحب نے کہا تھا: "آپ سب صاحبان آسمانِ سیاست کے تارے ہیں۔ لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کے دل میں آپ کے لیے جگہ ہے۔ آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے دُکھ کے ساتھ چند الفاظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آج ملک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے! یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جُھلس دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہو سکیں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطحِ اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ بربریت کے دور میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟"

تقریباً ۳۳-۳۴ سال کا عرصہ گزرا جب ذاکر صاحب نے قوم کے رہنماؤں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ اپیل کی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں' آج بھی ضرورت ہے کہ اُن کے اس پیغام کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو۔

ذاکر صاحب جب یہ خطبہ پڑھ رہے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورے پنڈال میں عجب کیفیت طاری تھی اور شاید بہت تھوڑی سی آنکھیں ہوں گی جو نم نہ ہوں۔ دشواری اور بڑے سے بڑے خطرے سے جب کبھی وہ دوچار ہوتے تو کبھی بھی ان کے منہ سے مایوسی اور ہمت شکنی کا کوئی لفظ نہیں سُنا گیا۔

مجھے یاد آتا ہے' ایک مرتبہ میری بیوی علیل تھیں اور میں اس وقت کشمیر میں تعینات تھا۔ میں نے ذاکر صاحب کو بیماری کی اطلاع تفصیلی خط سے دی لیکن ان کا جو مختصر جواب آیا وہ صرف یہ تھا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں، دعا کیجیے" اللہ تعالیٰ جتنی بڑی مصیبت ڈالتا ہے' اتنی ہی زیادہ بندے کو سہنے کی ہمت عطا فرماتا ہے۔

اسی طرح سب جانتے ہیں کہ انہوں نے شدید تباہی، تخریب اور مایوسی کے ماحول میں تخلیق اور تعمیر کے کاموں کا آغاز کیا اور بڑی سے بڑی پریشانی اور دقت سے مایوس نہ ہوئے۔ غالباً بہت کم لوگ اس واقعہ سے واقف ہیں کہ اُن کی تیسری بچی جس کا نام ریحانہ تھا' جس سے وہ بہت زیادہ محبت کرتے تھے' جب اس کی عمر مشکل سے چار سال ہوگی ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو کر اس کا اچانک انتقال ہو گیا۔ جس وقت اس بچی کا انتقال ہوا، ذاکر صاحب جامعہ کے ابتدائی اسکول کے بچوں کا نتیجہ سُنا رہے تھے اور کامیاب بچوں کو شیرینی تقسیم کی جا رہی تھی! گھر سے ملازم بھاگتا ہوا آیا اور ان کے کان میں کچھ کہہ گیا جس سے ایک دم اُن کا چہرہ پیلا پڑ گیا، لیکن وہ برابر بچوں کا نتیجہ سناتے رہے اور شیرینی تقسیم کرتے رہے۔ اتنے میں کچھ اُستادوں کو

گھر لے جانے کے لیے پہنچ گئے اور جب وہ نتیجہ سنا چکے تو اُن کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ یہ پوچھنے پر کہ آپ اطلاع ملنے پر گھر کیوں نہ پہنچے، تو ذاکر صاحب نے فرمایا، جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا، لیکن میں بچوں کا نتیجہ سنائے بغیر ان کو مایوس کر کے کیسے چلا آتا۔

ذاکر صاحب اپنے چھوٹے سے چھوٹے محسن کو بھی فراموش نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ شاید باعثِ دلچسپی ہو جو میں بتانا چاہتا ہوں۔

جامعہ ابتدائی دور میں قرول باغ میں تھی اور سخت مالی مشکلات سے دوچار تھی۔ اس وقت وہاں کے کام کرنے والوں کو معمولی سا معاوضہ بھی وقت پر نہ مل پاتا تھا۔ ذاکر صاحب بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ وہیں قرول باغ میں ایک شخص جس کا نام شبّا تھا، چھوٹی سی پرچون کی دکان کا مالک تھا۔ گو بہت چھوٹا سا دکاندار تھا مگر اس کی فراخدلی اور شرافت کا آج بھی وہ لوگ احترام کرتے ہیں جنھوں نے اُسے دیکھا ہے۔ ذاکر صاحب اور دیگر جامعہ والوں سے اس نے کہہ رکھا تھا کہ آپ لوگ آٹا، دال وغیرہ حسب ضرورت لے جایا کیجیے اور جب آپ کے پاس پیسے ہوں ادا کر دیجیے۔ زمانہ گزرتا گیا، جامعہ قرولباغ سے منتقل ہو گئی لیکن جب ذاکر صاحب صدر جمہوریہ منتخب ہوئے تو شبّا نے ایک پوسٹ کارڈ لکھا، جس میں تحریر تھا "شاید آپ مجھے بھول چکے ہوں، لیکن میری قرولباغ میں پرچون کی دوکان تھی اور میں آپ سب کے کھانے پینے کی چیزیں بیچا کرتا تھا۔" پوسٹ کارڈ دیکھتے ہی تیس چالیس سال پیشتر کی زندگی کی تصویر ذاکر صاحب کے ذہن میں آئی۔ فوراً ADC کو بلا کر کہا، گاڑی لے کر جایئے اور گردوارہ روڈ پر شبّا بنئے کی دوکان ہے اس کو احترام کے ساتھ مجھ سے ملانے کے لیے لائیے۔ جب یہ پیغام شبّا کو ملا، وہ انتہائی خوش ہوا اور تھوڑی دیر بعد وہ راشٹرپتی بھون پہنچ گیا۔ ذاکر صاحب اپنے دفتر سے باہر آئے اور اس کو ساتھ لے کر اندر گئے، چائے پلائی اور گذشتہ زمانے کی باتیں دیر تک کرتے رہے۔ جب شبّا اٹھ کر جانے کے لیے کھڑا ہوا تو وہ اس کو اپنے ساتھ لے کر دفتر سے باہر لائے، گاڑی میں بٹھایا اور دروازہ اپنے ہاتھ سے بند کیا۔ اس کے جانے کے بعد ملٹری سکریٹری صاحب نے کہا کہ جناب والا! یہ ہمارے پروٹوکول کی خلاف ورزی ہے، آپ کو اس طرح کسی کو لینے اور چھوڑنے آنا مناسب نہ تھا۔ ذاکر صاحب نے فرمایا، آپ کا پروٹوکول آپ کی جگہ پر ہے لیکن میرا یہ پروٹوکول تو میری زندگی کا ایک حصہ بن چکا ہے، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ شخص کون تھا۔ ملٹری سکریٹری نے لاعلمی کا اظہار کیا، تو ذاکر صاحب بولے یہ اگر یہ وسیع القلب انسان ہماری زندگی میں نہ آیا

ہوتا تو وہ شخص جو آج آپ کا راشٹرپتی بنا ہوا ہے، وہ اور اس کا خاندان فاقوں سے دوچار ہوئے ہوتے۔ ہم کس طرح سے اس کا احسان بھول سکتے ہیں!" وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جو ملت اپنے محسنوں کو بھلا دیتی ہے، اللہ تعالیٰ اس پر محسن اتار نا بند کر دیتا ہے۔

ذاکر صاحب کو صوفیوں اور بزرگوں سے ہمیشہ عقیدت رہی۔ انہوں نے بزرگوں کی تعلیمات اور زندگی کے حالات سے سبق سیکھا، وہ انسان کی محبت تھی جس میں نہ مذہب اور ملت کا امتیاز تھا، نہ رنگ و نسل کا لحاظ۔ یہی عقیدت تھی جس کی بنا پر وہ جامعہ کے قیام میں اکثر کئی میل کا پیدل سفر کر کے حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ پر حاضری دے کر فجر کی نماز ادا کرتے تھے۔

ان کی عقیدت مندی اور مہمان نوازی کا ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا آزاد سبحانی بڑے صوفی منش انسان تھے۔ ذاکر صاحب سے بہت محبت کرتے تھے اور اکثر ان کے یہاں آکر قیام کرتے تھے۔ مولانا آزاد سبحانی کو حقہ پینے کی بہت عادت تھی۔ اکثر رات کے وقت ذاکر صاحب خود اٹھ کر چلم بھر کر ان کے لیے حقہ پیش کیا کرتے تھے۔

جامعہ ملیہ کی اوکھلا میں عمارت کا جب سنگِ بنیاد رکھا جانے والا تھا، تو انہوں نے اس تقریب کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا:

"اس مبارک رسم کو انجام دینے کے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا گیا ہے جو نہ فرمانرواؤں میں سے ہے اور نہ ارکانِ سلطنت میں، نہ صاحبانِ دولت میں، نہ اربابِ علم میں، نہ رہبرانِ ملک میں، نہ اکابرِ قوم میں! جو کچھ بھی نہیں ہے مگر سب کچھ ہو سکتا ہے! یہ جامعہ کا سب سے چھوٹا بچہ ہے۔ اربابِ نظر اس انتخاب کی داد دیں گے اور یہ تسلیم کریں گے کہ مستقبل کا مالک ہم حال کے غلاموں سے اس منصب کے لیے کہیں زیادہ موزوں ہے۔"

سنگِ بنیاد رکھنے میں جو یہ ندرت اختیار کی گئی وہ صرف ذاکر صاحب کا حصہ تھی، کیونکہ ان کی نظر حال سے زیادہ مستقبل پر رہا کرتی تھی۔

ذاکر صاحب ہر شخص کو عزت اور محبت کا مستحق سمجھتے۔ ہر مذہب اور ملت کے لوگ ان سے ملتے اور ان کے سلوک اور محبت میں کوئی فرق نہ پاتے۔ وہ انسان سے کبھی مایوس نہ ہوتے تھے اور بڑی سے بڑی خطاؤں سے چشم پوشی کرتے اور بُرے سے بُرے آدمی کی اصلاح کی امید ان کے دل میں رہتی۔ ان کا

تول تھا یہ آدمی آدمیوں کے متعلق اچھے سے اچھا گمان رکھے اور چاہے روز فریب کھائے لیکن ہر روز نئے سرے سے آدمیوں کی نیک دلی پر یقین کرے ۔"

وہ ایک مذہبی انسان تھے۔ لیکن مذہب کو قطعی شخصی معاملہ سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں نمود اور نمائش سے سخت نفرت تھی۔ اکثر ایسا دیکھا گیا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر کلام پاک کی تلاوت پوری کرتے اور رات کو سوتے وقت ہمیشہ قرآن پاک کی مختلف سورتوں کے ریکارڈ سنا کرتے۔ اگر اس وقت گھر کا کوئی فرد ان کے کمرہ میں موجود ہوتا تو فرماتے' بھائی اب ہمیں اکیلا چھوڑ دیجے۔ ایک مرتبہ میری بیوی سے فرمایا کہ نماز کے بعد تم کیا دعا کرتی ہو۔ انہوں نے جواباً کہا میں آپ کی درازیٔ عمر اور اپنے خاندان کی بہتری کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتی ہوں۔ سُن کر فرمایا" بھائی تم تو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں مداخلت کرتی ہو۔ دعا میں صرف یہ کہنا چاہیئے: "اے خدا اپنی مرضی بتا دے۔ اپنی مرضی پر راضی کردے اور اپنی مرضی پر چلا دے۔"

بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ راتوں کو وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے، کافی وقت نمازوں میں گزارتے۔ وہ کبھی اپنی عبادت کو ظاہر نہ ہونے دیتے، زیادہ تر تنہائی میں اپنے معبود حقیقی سے لَو لگاتے۔ ان کی زندگی کا یہ رُخ دنیا والوں سے تو کیا گھر والوں سے بھی بڑی حد تک پوشیدہ تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے میری بیوی سے فرمائش کی کہ ایسی ٹوپی سی دو جو پیشانی کو چھپالے۔ یہ عجیب و غریب فرمائش اس لیے کی گئی تھی کہ ماتھے پر سجدوں کا نشان ان کی عبادت کا راز افشا نہ کر دے۔

ڈاکر صاحب پہلی جنگ عظیم کے بعد جب یورپ اعلیٰ تعلیم کے لیے جانا چاہتے تھے تو اس وقت کی انگریزی حکومت نے اُن کو بڑی دقّت سے پاسپورٹ دیا اور شرط یہ لگادی کہ وہ صرف انگلستان میں ہی تعلیم حاصل کرسکتے ہیں۔ بظاہر ذاکر صاحب اس قسم کی شرط کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن وہ سفر پر تیار ہو گئے' اور جب جہاز اٹلی کے بندرگاہ پر رُکا تو وہ وہاں اتر پڑے اور سیدھے بذریعہ ریل برلن چلے گئے'۔ کیونکہ ان کے پاسپورٹ میں اجازت صرف انگلستان جانے کی تھی لہٰذا ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ انگلستان جائیں۔ مگر ذاکر صاحب نے قطعی انکار کر دیا اور مجبوراً جرمن حکومت کو برلن میں رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دینی پڑی۔

ذاکر صاحب نے جب صدر جمہوریہ منتخب ہونے پر حلف لیا تھا تو ان کے یہ تاریخی الفاظ تمام ملک میں گونج اٹھے تھے :" سارا بھارت میرا گھر ہے اور اس کے رہنے والے میرا پریوار ۔"

ذاکر صاحب ان قومی رہنماؤں میں تھے، جنہوں نے ہمیشہ بھید بھاؤ، پھوٹ اور علیحدگی پسندی کے تخریبی رجحانات کی مذمت کی اور ان کی جگہ اتحاد، اتفاق، محبت، اخوت اور رواداری کی تعریف کی۔

ان کی ہر تقریر، تحریر اور کردار سے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، جذباتی ہم آہنگی اور آپسی میل ملاپ کے لیے بے لوث محبت کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ سماج میں ذہنی تعاون کی راہیں وسیع سے وسیع تر ہوتی جائیں تاکہ اس سے محبت اور بھروسے کے ایسے سوتے پھوٹیں کہ ساری قومی زندگی اس سے سیراب ہو، جو ہماری سماجی زندگی کا رنگ ہی بدل دے۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب کا قول تھا کہ آپسی اتحاد اور اعتماد کے لیے ہمیں سچائی اور احترام اور رواداری برتنا ضروری ہے تاکہ انسان، انسان میں فرق نہ رہے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو ہم نہ صرف اپنے رب کے حضور سرخرو ہوں گے، بلکہ ذہنی سکون اور قلبی راحت میسر ہوگی۔

ذاکر صاحب کا شعر و ادب کا ذوق بڑا ستھرا اور پاکیزہ تھا اور اُردو، فارسی کا مطالعہ وسیع تھا۔ فارسی اور اُردو کے پسندیدہ اشعار اپنی بیاض میں لکھتے رہتے تھے۔ ذاکر صاحب اقبالؒ کی شاعری اور ان کے فلسفے سے بھی بہت متاثر تھے اور میں سمجھتا ہوں اقبال کے یہ چند اشعار ان کے کردار اور شخصیت کی صحیح عکاسی کرتے ہیں:

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز ۔۔۔ اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم ۔۔۔ اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ ۔۔۔ غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات ۔۔۔ ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل ۔۔۔ اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

ذاکر صاحب کو پھولوں سے اور باغبانی سے زیادہ دلچسپی تھی اور خاص طور سے گلابوں سے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں قدیم اور نادر پتھروں کے جمع کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ ایک مرتبہ میری بیوی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کو پتھروں سے اتنی کیوں دلچسپی ہے تو فرمایا پتھر مایوس نہیں کرتے اور ضرورت پڑنے پر مارنے کے کام بھی آجاتے ہیں۔ ایک مرتبہ دو چار روز تک میری بیوی ان سے ملنے کچھ مصروفیات کی وجہ سے نہ جا سکیں

تو ٹیلیفون پر خیریت دریافت کی اور پوچھا آنا کیوں نہیں ہوا، تو انھوں نے کہا اماں نے بلایا ہی نہیں، ورنہ میاں ضرور آتی۔ ذاکر صاحب نے جواب دیا "بھائی جس مجرم کو احساس جرم ہی نہ ہو اس سے شکایت کیسی؟"

ذاکر صاحب کی زندگی اور خدمات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور غالباً ابھی اور لکھا جائے گا۔ دراصل ان کی شخصیت ایسی جاذب اور ہمہ گیر تھی کہ وہ تو ریسرچ کا ایک بہت اچھا موضوع بن سکتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان کی زندگی کے ابھی بہت سے گوشے ابھر کر سامنے آئیں گے، اگر کسی نے دلجمعی کے ساتھ اس ریسرچ کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔

جس روز ذاکر صاحب کا انتقال ہوا میں تنہا ان کے کمرے میں میت کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد سر اٹھا کر ان کی میز کی طرف دیکھا جو پلنگ کے پاس رہتی تھی اور عموماً اس پر بہت سی کتابیں رکھی رہتی تھیں جن کا وہ مطالعہ کیا کرتے تھے۔ ان کتابوں کے پاس ایک چھوٹے سے پرچے پر یہ مصرع لکھا تھا:

ع میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

شاید ہی اس سے بہتر اور موزوں کوئی تحریر اس گوہر نایاب کے کھو جانے کی ترجمانی کر سکے۔

(۲۴ اپریل ۱۹۸۱ء کو خدا بخش لائبریری میں سنایا گیا)

● ●

بیگم صالحہ عابد حسین

بیگم صالحہ عابد حسین: (پ۔ پانی پت ۱۹۱۳ء)۔ خواجہ غلام الثقلین کی صاحبزادی، خواجہ غلام السیدین کی ہمشیرہ؛ ڈاکٹر سید عابد حسین کی بیگم، تقریباً چالیس کتابوں کی مصنفہ؛ آٹھ ناول (آتشِ خاموش، اُلجھی ڈور وغیرہ)؛ چھ افسانوں کے مجموعے، دو ڈراموں کے مجموعے؛ میر انیس پر تین کتابیں؛ خواجہ الطاف حسین حالی پر تین کتابیں؛ ذاکر صاحب پر ایک اہم کتاب؛ خواجہ غلام السیدین پر ایک کتاب، معاصر مشاہیر پر ایک کتاب اور تقریباً ایک درجن سے زائد بچوں کے لئے کتابیں۔

ڈاکٹر عابد حسین جامعہ کی تین اہم بنیادی شخصیتوں میں سے ایک تھے جنھوں نے ذاکر صاحب اور مجیب صاحب کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ ۱۹۳۰ء سے صالحہ عابد حسین بھی اپنے شوہر کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین کے نظریات اور ان کی پوری سرگرمیوں میں عملی طور پر شریک رہیں۔

●●

قدرت بعض وقت بے پناہ فیاضی پر اتر آتی ہے اور کسی ایک آدمی کو اتنی صفات عطا کر دیتی ہے کہ وہ مظہرِ شانِ حسنِ فطرت بنجاتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین انھیں اِنی گنی ہستیوں میں سے ایک تھے، نہیں —— ہیں کہ ایسی شخصیتیں کبھی ماضی میں غروب نہیں ہوا کرتیں۔ حُسنِ صورت اور حُسنِ اخلاق، ذوقِ جمال اور غیر معمولی ذہانت، سچی خدا پرستی اور گہری انسان دوستی، ظرافت اور شرافت، سادگی اور معصومیت ان سب کا اس خوبی سے ایک انسان میں امتزاج نظر آتا کہ دیکھنے والے ششدر رہ جاتے تھے اور جب ان کے زیادہ قریب آتے، تو ہمیشہ کے لیے گرویدہ ہو جاتے۔ ان کی شخصیت کی رنگا رنگی اور سیرت کی گہرائی کو پرکھنا آسان کام نہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے معمار اور رہنما، ماہرِ تعلیم، مدبّر، عالم، ادیب، جنگِ آزادی کے سپاہی اور صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کے کارناموں پر روشنی ڈالنا میرا منصب نہیں ہے۔ ہاں، ۳۶ برس ان کی دوستی اور قربت کا شرف مجھے ضرور حاصل رہا ہے اور ان میں سے ۱۵ سال تو ایسے گزرے، جب روزانہ ہی ان سے ملنا جلنا رہا۔ میں نے انھیں رنج و راحت میں، تنگ دستی اور مشکلات میں، گھر میں اور جامعہ میں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اور ان کے کاموں میں ہاتھ بٹایا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ذاکر صاحب صرف ہمارے تھے —— جامعہ والوں کے۔

یہ جامعہ کی زندگی کا وہ زمانہ تھا، جب مالی پریشانیاں بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ کئی کئی مہینے جامعہ کے کارکنوں کو وہ قلیل تنخواہ بھی نہیں ملتی تھی جو جسم و جان کے رشتے کو جوڑے رکھنے میں کسی نہ کسی حد تک کامیاب ہوتی تھی۔ مگر میں نے اس زمانے میں بھی جامعہ کے خادموں میں سے کسی کو بددل، بیزار، ناراض یا پریشان نہیں پایا اور سب سے خوشدل ہستی تھی جامعہ کے کرتا دھرتا خود ڈاکٹر ذاکر حسین کی، جن کی حیثیت جامعہ کے لیے گویا روحِ رواں کی تھی۔ وہ ہمعمر رفیقوں کے دوست اور بھائی تھے تو نوعمر ساتھیوں اور جامعہ کے بچوں کے باپ —— ایسے باپ جن کی شفقت میں اکثر ماں کی ممتا کا رس اور مٹھاس نظر آتی تھی۔

ذاکر صاحب جامعہ کے لیے چندے کی مہم میں شفیق قدوائی مرحوم اور حافظ فیاض مرحوم کے ساتھ اکثر

خود بھی جایا کرتے تھے ـــــ مگر کیا انداز تھا، چندہ مانگنے کا۔ کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی۔ چاہے جامعہ میں فاقے ہو رہے ہوں مگر اس کے وقار اور خودداری کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔ اکثر کہا کرتے تھے "جو جامعہ کو چندہ دیتا ہے وہ احسان نہیں کرتا بلکہ یہ خود اس کے لیے سعادت ہے۔ دیکھنا وہ دن آئے گا جب لوگ خود آئیں گے اور خوشامد کر کے اسے چندہ دیا کریں گے۔ ویسے ان کی طبیعت میں بہت انکسار تھا۔ اپنے سے، بڑوں سے، چاہے وہ عمر میں بڑے ہوں، یا حیثیت میں، یا (ان کے خیال میں) علم و عقل میں بڑے ہوں، وہ ان سے بڑی عزت اور ادب سے ملتے تھے، مگر یہ جھک کر ملنا کسی غرض کے لیے ـــــ خواہ وہ جامعہ ہی کی غرض کیوں نہ ہو، نہیں ہوتا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے وہ بے تکلف بھی تھے۔ ان سے محبت بھی کرتے تھے۔ کبھی کبھی انھیں ڈانٹتے اور چھیڑتے بھی تھے اور بضرورت انھیں ہدایتیں اور مشورے دیتے اور ان کی سنتے بھی تھے۔ پھر کبھی کبھی وہ ان سے روٹھ بھی جاتے تھے اور اگر کبھی وہ روٹھ جائیں، تو ان کو بڑی محبت سے منا بھی لیتے تھے۔ ان سے لوگوں کو شکایتیں ضرور پیدا ہوتیں، مگر بس ذرا دیر کو، ان کا مسکراتا چہرہ یا دلداری کا ایک فقرہ سب گلے ختم کر دیا کرتا تھا۔ انھیں اپنے ساتھیوں کی مالی پریشانیوں اور کٹھنائیوں کا بڑا احساس تھا۔ ان سب کے ساتھ وہ خود بھی بڑی سادگی اور تنگدستی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اگرچہ اس سادگی میں بھی ہمیشہ پرکاری کی شان نظر آتی۔ ان کا گھر نفاست، صفائی اور سلیقے کا نمونہ تھا۔ ان کے کھانے میں چاہے صرف گو بھی گوشت یا ارد کی دال ہی ہوتی، مگر اتنی مزیدار کہ عمدہ سے عمدہ قورمہ اور پلاؤ، زردہ، اس پر قربان! لباس سفید کھدر کا ہوتا، مگر اتنا شفاف اور بے داغ اور سجل سلا ہوا جس سے ان کی جامہ زیبی اور بڑھ جاتی۔ اس کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے گھروں میں اگر سلیقہ اور صفائی دیکھتے، خوش ذوقی اور نفاست پاتے تو بہت خوش ہوتے، ہمت بڑھاتے اور سراہتے تھے۔ کہیں سے چندے کا روپیہ ملتا، تو سب سے پہلے چپراسیوں، منشیوں اور استادوں میں تقسیم ہوتا۔ پھر ان ساتھی پروفیسروں کو دیا جاتا جو گھر سے بھی آسودہ حال نہ تھے۔

اور سب سے آخر میں کبھی کبھی خود شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو بھی ان کی تنخواہ کی "خطیر" رقم ۷۵ روپے مل جاتے۔ مگر یہ غریبی اور مفلسی مجبوری کی نہ تھی بلکہ اسے ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر ذاکر صاحب اور ان کے رفیقوں نے خود بطیب خاطر اپنایا تھا۔ اسی لیے یہ لوگ اپنے پر رحم نہیں کھاتے تھے بلکہ ملک کے بڑے سے بڑے امیر سے امیر آدمی سے آنکھ ملا کر بات کرتے، سر اٹھا کر چلتے؛ خود رحمی اور احساس کمتری ایسے جذبے تھے، جن سے یہ اولوالعزم مجاہد کبھی آشنا ہی نہیں ہوئے۔

مجھے جامعہ جوبلی کا وہ زمانہ یاد آرہا ہے، جب ذاکر صاحب اور ان کا ایک ایک ساتھی، جامعہ کا ایک ایک بچہ، جامعہ کی عورتیں تک سبھی اس جشن کو کامیاب بنانے اور بہترین طریقے سے سرانجام دینے میں دل وجان سے جٹے ہوئے تھے۔ کیونکہ ذاکر صاحب نے عمر بھر ان کو یہی درس دیا تھا کہ "جو کام کرنے کے لائق ہے، وہ اس قابل بھی ہے کہ اسے اچھی طرح سے کیا جائے۔" اور اس وقت ذاکر صاحب کا ہر ایک ساتھی اسی زریں قول پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ہزاروں کام تھے اور اس پر ہزاروں جھگڑے اور ہر ایک مدد، مشورے، شکایت یا ہدایت کے لیے ذاکر صاحب کے پاس دوڑا جاتا تھا۔ ان کے دو ایک دوست بہت چاہتے کہ ذاکر صاحب کو اتنے کاموں کے بوجھ سے بچائیں، مگر اس کا کیا علاج کہ ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنا دکھ درد خود ذاکر صاحب سے کہے، وہی اس کی مشکل کا حل نکالیں، اور اس بہانے اس محبوب ہستی سے بار بار ملاقات ہو، باتیں ہوں، ان کی تنبیہ اور پھر دلداری نصیب ہو۔

ٹریننگ کالج اور ذاکر صاحب کے گھر سے جو سڑک جامعہ کی مرکزی عمارتوں کی سمت جاتی ہے، جوبلی سے پہلے وہ کچی اور اونچی نیچی تھی اور بیچ سڑک پر ایک بہت بڑا گڑھا تھا جس سے بڑی مشکل سے گزرا جا سکتا تھا۔ طے ہوا کہ اسے خود جامعہ کے کارکن اور طالب علم بنائیں گے اور جو بات ایک مرتبہ ذاکر صاحب طے کرلیں، یہ گویا ضمانت تھی اس کی کہ اب یہ ہو کر رہے گی۔ ایک صبح کھڑکی سے میں نے جھانکا تو کیا دیکھتی ہوں کہ اس بڑے گڑھے پر کھڑے جامعہ کے استاد اور پروفیسر اور طالب علم ہاتھوں میں پھاوڑے اور ٹوکریاں لیے سڑک کی مرمت کی ابتدا کر رہے ہیں اور نکلتے سورج کا منور چہرہ ان کے چہروں کی سچی مسرت کے نور سے مقابلہ نہیں کر پا رہا۔ ذاکر صاحب وسط میں کھڑے تھے، ان کے برابر ان کے رفیق کار عابد صاحب تھے کہ اتنے میں سامنے سے دلی کے ایک معزز، مہذب رئیس آتے نظر آئے، وہ ان صاحبانِ علم وفضل کو پھاوڑے چلاتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ لیکن ٹھہرے خلیق اور مہذب آدمی، موٹر روکی، اترے، صاحب سلامت ہوئی اور ذرا سا عابد صاحب کی طرف جھک کر اخلاقاً بولے: "ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں ـــــ یہ کام آپ کا نہیں، ہمارا ہے۔" عابد صاحب نے انھیں اپنی روایتی بے پناہ ظرافت کا نشانہ بناتے ہوئے پھاوڑا ان کی طرف بڑھایا اور فرمایا: "تو لیجیے بسم اللہ" ذاکر صاحب کے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا اور نواب صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ غرض چند دن میں لڑکوں اور مزدوروں کی ان تھک کوشش سے یہ سڑک بن گئی۔

جوبلی میں چند ہی دن رہ گئے تھے۔ کاموں میں تیزی آگئی تھی۔ ذاکر صاحب اپنا خطبہ لکھنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ جی ہاں کوشش۔ وہ جتنا اچھا لکھتے تھے، اتنا ہی لکھنے سے کتراتے اور پڑ جائے سر پر مصیبت تو بگڑتے، اُلجھتے، گھبراتے اور کبھی کبھی تو بیمار ہو جاتے تھے۔ یہاں ان چیزوں (مثلاً بچوں کی کہانیوں) کا ذکر نہیں، جو انھوں نے اپنی خوشی سے لکھی تھیں۔ اور مزے کی بات یہ کہ جب یہ تحریر مکمل ہو کر سامنے آتی تو اردو ادب کا ایک جواہر پارہ ہوتی تھی۔ ان کی یہی وہ تقریر تھی جس کو سُن کر سارے دیس کے وہ بڑے بڑے لوگ لیڈر، رہنما، رئیس، امیر اور ہزاروں عام لوگ اور صاحبانِ علم و فضل زار و قطار رونے لگے تھے، جن میں انھوں نے اپنے ساتھیوں کی کچھ اس انداز سے مدح کی تھی، جیسی شاید ہی کسی سردار نے کی ہو۔ ہاں، تو ذاکر صاحب اس خطبے کو لکھنے کی اُلجھن میں تھے کہ بیچ بیچ ان کے ایک بزرگ ساتھی جو چندہ جمع کرنے کا کٹھن کام بھی کر رہے تھے کسی سلسلے میں ان سے مشورہ کرنے پہنچے۔ غالباً مالی مشکلات کا ذکر ہوگا۔ ذاکر صاحب کچھ اُلجھے ہوں گے، کچھ اکھڑے اکھڑے جواب بھی دیے۔ کیونکہ چھیڑ کر، ستا کر لوگوں کی قوتِ عمل کو اُکسانے کا کام انھیں بہت مرغوب تھا۔ میں اپنے اُوپر کے کمرے کی صفائی کر رہی تھی، کھڑکی میں سے دیکھا کہ آگے آگے مرحوم روتے ہوئے بھاگے جا رہے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے ذاکر صاحب صرف کرتا، پاجامہ اور سلیپر پہنے اپنے بھاری بھرکم جسم کے ساتھ بھاگ رہے ہیں۔ میرے گھر کے سامنے پہنچتے پہنچتے ذاکر صاحب نے اُن کو آلیا، اور ان کے گلے میں باہیں ڈال کر کھینچ کر اپنے گھر لے جانے لگے۔ اس پر وہ صاحب روتے روتے ہنس پڑے اور ہم لوگ اس دلچسپ منظر کو اور ان محترم اور بزرگ ہستیوں کی یہ سادہ اور بھولی ادائیں دیکھ کر ہنستے رہے۔

جامعہ کے لوگوں کی بیویاں ذاکر صاحب کو اپنا جیٹھ اور بزرگ سمجھتیں اور ان کا بہت احترام کرتی تھیں۔ مگر ان سے تھوڑا ڈرتی اور کبھی کبھی شکایت بھی کر لیا کرتیں ——— ذاکر صاحب کی کم، جامعہ کی زیادہ۔ ان میں سے اکثر یہ سمجھتی تھیں کہ ان کے شوہر جو اس قلیل تنخواہ پر جامعہ میں پڑے ہیں، تو یہ ذاکر صاحب ہی کی محبت میں تو ہے۔ کبھی کبھی خود ذاکر صاحب بھی انھیں چھیڑنے کے لیے کوئی ایسی بات کہہ دیتے، جس سے یہ بیچاریاں گھبرا جاتیں۔ جامعہ نگر آنے کے بعد جگہ کی قلت تھی۔ بعض گھرانے تو جامعہ کی عمارتوں ہی میں ایک ایک، دو دو کمروں میں رہنے لگے تھے، بعض نے کسی دوسرے کے گھر میں ایک آدھ کمرہ لے لیا تھا، پانچ چھ نے اپنے رہنے کو ذاتی گھر بنوا لیے تھے۔ باقی لوگ ذاکر صاحب سے جگہ کے لیے کہتے رہتے تھے کہ تھوڑی

کی آمدنی میں اُن کے لیے دو دو جگہ کا خرچ اٹھانا مشکل تھا۔ ایسے ہی کسی وقت میں ذاکر صاحب نے کہیں کہہ دیا کہ میں تو جن لوگوں کے بال بچے یہاں ہیں، ان سب کو ان کے وطن بھیج دوں گا اور سب گھر خالی کرا لوں گا! مجھے بچوں کے لیے جگہ کی ضرورت ہے۔ جامعہ کی عورتوں میں سنسنی سی پھیل گئی۔ "لیجیے، یہ جامعہ کا سردار تو اب ہمارے "گھریلو معاملات" میں بھی دخل دینے لگا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ ان کے شوہر اپنے ذاکر صاحب کا کوئی حکم کبھی ٹال نہیں سکتے۔ کچھ خواتین نے آکر مجھ سے فریاد کی۔ میں نے انہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش کی کہ یہ تو ذاکر صاحب کا مذاق کا انداز ہے۔ مگر پھر ان کے اصرار پر کچھ ڈرتے ڈرتے میں نے ہنسی کے پردے میں چھپا کر ذاکر صاحب سے یہ بات کہی۔ پہلے تیوری پر ذرا سے بل اُبھرے، لہجہ بھی تیز تھا: "ہاں، ہاں، میں آپ سب کو اپنے اپنے گھر بھیج دوں گا ــــ اپنی بیوی کو بھی ــــ مجھے مکانوں کی ضرورت ہے۔" بیگم ذاکر بولیں "ائے ہے، سُنا کرو ان کی باتیں! بھیج دیں گے۔" میں نے ہمت کر کے کہا: "اپنے گھر کہاں بھیج دیں گے؟ کون سا گھر؟ ہمارا گھر تو اب یہی ہے ــــ یہی آپ کی جامعہ۔ ہم اب اور کہاں جائیں گے؟" ہنس پڑے اور اس کھلے دل کی بے ریا ہنسی نے سب کے اندیشے دُور کر دیے۔

جامعہ کی خواتین، جو سامنے آتیں وہ بھی، جو پردہ کرتیں وہ بھی، ان کی بھابیاں تھیں؛ نہیں نہیں، ان کی لڑکیوں، ان کی بیٹیوں کی طرح تھیں۔ اکثر ملنے جاتے۔ بیگم ذاکر سے وہ لوگ ملنے آتیں تو ذاکر صاحب بھی بڑے اخلاق سے ان سے ملتے۔ کوئی بیمار ہوتا، تو دوا دارو کی فکر ہوتی۔ کسی کے ہاں بچّہ ہوتا تو مبارک باد کو پہنچ جاتے۔ شادیوں میں شریک ہوتے، تحفے دیے جاتے۔ کوئی غمی ہو جاتی تو ذاکر صاحب کی ہمدردی ٹوٹے دلوں پر مرہم کا کام کرتی۔ مجھے یاد ہے، ابھی چند سال پہلے کی بات ہے، جامعہ کے ایک پرانے کارکن کا دلّی سے باہر کہیں انتقال ہو گیا اچانک خبر سے ان کے بیوی بچّوں پر قیامت ہی تو گزر گئی۔ ذاکر صاحب اس زمانے میں نائب صدر تھے۔ سنتے ہی پہنچے۔ مرحوم کی لڑکیوں کو گلے لگایا، دلاسا دیا۔ ان کے چہرے کی یہ کیفیت کہ دیکھی نہ جاتی تھی اور جب بیوہ کے پاس پہنچے تو وہ عالمِ بیقراری میں ذاکر صاحب سے لپٹ کر یوں بلک بلک کر رو اور چیخ رہی تھیں جیسے ذاکر صاحب اس کے سگے بڑے بھائی ہوں۔ ذاکر صاحب خاموش کھڑے تھے اور ان کی آنکھوں سے برکھا ہو رہی تھی۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں جامعہ کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے کا عظیم کام انجام دینے کے بعد ۱۹۴۸ء میں ذاکر صاحب کو جامعہ سے جانا پڑا۔ اب قوم نے ان کے کندھوں پر اور بڑی بڑی ذمہ داریاں ڈالی تھیں: مسلم یونیورسٹی،

پھر بہار کی گورنری، نائب صدر جمہوریہ کے منصب کی ذمّہ داری اور آخر میں صدر جمہوریۂ ہند، ملک کے سب سے بڑے عہدے کی ذمّہ داری اٹھانے پر مجبور کیا گیا۔ جی ہاں، یہ سچ ہے کہ ان میں سے کوئی جگہ خود انھوں نے کوشش کر کے حاصل نہیں کی تھی۔ یہ اعزاز انھیں پیش کیے جاتے تھے، اصرار کیا جاتا تھا، تب کہیں وہ اپنے ساتھیوں کے مشورے سے انھیں قبول کرتے تھے اور کون نہیں جانتا کہ ہر عہدے کو انھوں نے چار چاند لگائے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ کہیں بھی رہتے ہوں، وہ جامعہ سے کبھی دُور نہیں ہوئے۔ ان کا دل جامعہ ہی میں دھڑکتا رہا اور جامعہ کا دل ان کے سینے میں۔ علی گڑھ تو چار قدم پر ہے، لوگ جب چاہتے ان سے ملنے پہنچ جاتے۔ ان کی چھوٹی لڑکی صفیہ کی شادی ہوئی، تو آدھی جامعہ مہمان تھی اور ذاکر صاحب ایسے خوش کہ گویا اب آئے ہیں۔ ان کے خاندان والے۔ طرح طرح سے خاطر داریاں ہو رہی ہیں۔ قائم گنج کے باورچیوں سے مانڈے اور یخنی پکوا کر کھلائی جا رہی ہے۔ بہار میں بھی لوگ ملنے پہنچ جاتے تھے۔ وہ خود دہلی آتے، تو جامعہ ضرور آتے۔ پھر نائب صدر ہو کر تو دلّی ہی آ گئے تھے اور جامعہ والے جب چاہیں، اپنے اس بزرگ دوست اور ساتھی کے پاس جا سکتے تھے، اگرچہ ذاکر صاحب کی کمزور صحت اور مصروفیت کو دیکھتے ہوئے ان کے اکثر دوست ہمیشہ یہی کوشش کرتے کہ جہاں تک ممکن ہو، ذاکر صاحب کو زحمت نہ دیں، ان سے کم سے کم ملیں۔ مگر پھر بھی اپنی ہر خوشی میں انھیں شریک کیے بغیر چین نہ آتا۔ کٹھنائیوں میں مشورہ، ان سے نہ لیتے تو اور کس سے لیتے! غم میں شرکت کرنے تو وہ خود ہی پہنچ جاتے تھے۔ جامعہ والے ملنے جاتے (اور اس میں کوئی استثنا نہیں ہے، وائس چانسلر اور پروفیسروں سے لے کر چپراسی، منشی تک سبھی شامل ہیں) تو معمول سے زیادہ وقت انھیں دیتے۔ ان کی باتیں سنتے، اُن سے باتیں کرتے، دل کھول کر، جیسے بچھڑے بھائیوں سے کی جاتی ہیں۔ تھوڑا سا بھی وقت ہوتا تو ان کو اٹھنے سے روکتے، ان کی خاطر داریاں ہوتیں۔ پھر ذاکر صاحب جامعہ ملیہ کے امیر یعنی چانسلر منتخب ہوئے، تو سارے جامعہ میں سچی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اب ذاکر صاحب پھر سارے ہی، جامعہ کے سب سے بڑے سردار، وہ صدر جمہوریہ منتخب ہوئے، تو معلوم ہوتا تھا یہ اعزاز ذاکر صاحب کو نہیں خود جامعہ کو ملا ہے۔ ذاکر صاحب سارے دیس کے ہوں، ساری دنیا کے ہوں، مگر سب سے قریبی اور قدیم رشتہ تو ان کا جامعہ ہی سے ہے نا۔ اب بھی جامعہ والے اس عظیم الشان عمارت میں ان سے ملنے جا سکتے تھے، جہاں ایک مسکراتا چہرہ دلی خوشی کے ساتھ ان کا استقبال کرتا، باتیں کرتا، وقت سے زیادہ بٹھاتا اور رخصت

کرنے دروازے یا لفٹ تک آتا۔ وہ چھوٹا سا خوب صورت پھولوں سے گھرا حسین گھر جو ذاکر صاحب نے جامعہ نگر میں بنایا تھا، انتظار کر رہا تھا کہ کب ذاکر صاحب ان جلیل القدر عہدوں سے سبکدوش اور فارغ ہو کر پھر آکر اُسے بساتے ہیں۔ جامعہ کے لوگ اس سنہرے دن کے منتظر تھے۔ ایک ایک گھڑی گن گن کر کاٹ رہے تھے کہ کب ذاکر صاحب یہاں آکر رہیں گے۔ ان کے پُرانے رفیق اور گہرے دوست اس دن کا انتظار کر رہے تھے۔ جب بیسیوں برس کی پُرانی بے تکلف صحبتیں اور ذاکر صاحب کی قربت کی نعمت پھر سے انھیں نصیب ہوگی۔ مگر آہ، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! اگر ذاکر صاحب جامعہ کو بھولے نہیں۔ جس ننھے پودے کو اُنھوں نے خونِ جگر سے سینچا تھا جس کی دن رات خدمت میں انھوں نے اپنی عمرِ عزیز کے ۲۲ برس کھپائے تھے اُسے کیسے بھول سکتے تھے! آج ان کی آخری آرامگاہ کے دونوں طرف جامعہ کی عمارتیں ہیں۔ پہلو میں جامع مسجد بن رہی ہے۔ دوسری طرف گلابوں کا تختہ ہے اور ان سب کے درمیان ہمارے ذاکر صاحب ابدی نیند سو رہے ہیں۔

۲

ذاکر صاحب بہت اچھا لکھتے تھے، بہت تیز لکھتے تھے مگر بہت کم لکھتے تھے۔ کسی کام سے اتنا نہ گھبراتے تھے جتنا لکھنے سے۔ اکثر مجبوراً کہیں کچھ لکھنا ہوتا یا بولنا ضروری ہوتا تو کسی دوست سے بھی لکھوا لیتے تھے۔ دوست منھ سے نہ نکالتے مگر وہ خود بے تکلف لوگوں سے اس کا اقرار کر لیتے تھے۔ ان کا انداز اتنا منفرد ہوتا تھا کہ صاحبانِ ذوق خود بھی پہچان لیتے تھے۔

ایک بار میں نے کہا: "ذاکر صاحب! آپ جیسا عمدہ لکھنے والا، اور لکھنے سے اتنا گھبرائے۔ سمجھ میں نہیں آتا!" کچھ مسکرائے۔ شرمائے۔ جھنجھلائے، اور بولے "مگر مجھے تو لکھنا آتا نہیں"۔ ان کی سب سے معرکۃ الآرا تقریر وہ تھی جو انھوں نے جوبلی کے جلسے میں کی تھی۔ کس قدر اُلجھے تھے، گھبرائے تھے۔ اور پھر دو تین دن گھر میں بند ہو کر یہ تقریر تیار کی تو ایسی کی کہ آج تک سننے والے سر دھنتے ہیں اور اُس وقت سر نہیں دھن رہے تھے، سارا جلسہ چشم پُر آب تھا۔

دراصل جم کر بیٹھنا مناسب ہی نہ تھا اور کچھ عادت بھی بن گئی تھی۔ یا خود اپنے کو یقین دلا دیا تھا کہ مجھے لکھنا نہیں آتا۔ اس ضمن میں اپنا ایک ذاتی قصہ یاد آتا ہے۔ کشمیر میں ان سے تقریر لکھوانے کا قصہ۔ وہ تقریر

بھی میرے پاس موجود ہے۔

(۳)

ذاکر صاحب کا یہ ایک نادر اور نرالا خط ہے۔ اس وقت وہ جنیوا کے ایک اسپتال میں داخل تھے جہاں ان کی آنکھ کا آپریشن ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ۴۷ء کی قیامت کے بعد عابد صاحب دلّی سے نئی روشنی نکالنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ذاکر صاحب نے جس حالت اور جس انداز میں 'نئی روشنی' کی پذیرائی کی اور جس طرح یہ خط لکھا وہ انہی کا کام تھا۔ یہ خط 'نئی روشنی' نکلنے کے زمانے میں عابد صاحب کو وصول ہوا تو انھوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کے 'نئی روشنی' کے پرچے میں "نورِ بصیرت" کے عنوان سے اس نوٹ کے ساتھ اسے شائع کیا تھا:

"یہ ذاکر صاحب کا مکتوبِ گرامی ہے، جو انھوں نے آنکھوں کے آپریشن کے بارھویں دن لکھا تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی، مگر دل کی آنکھیں روشن تھیں۔ ہاتھ کی جنبش بصارت کی مدد کے بغیر بصیرت کا پیام پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کاغذ پہ ٹیڑھے میڑھے نقش بنے اور آپس میں گڈمڈ بھی ہو گئے، بڑی مشکل سے پڑھے گئے، مگر پڑھ لیے گئے ....." اس نوٹ کے تحت ذاکر صاحب کا یہ خط درج ہے، جو میں اس وقت آپ کو سنا رہی ہوں۔ اصل خط غالباً اسی زمانے میں اِدھر اُدھر ہو گیا کہ اس وقت ان کی ڈاک 'نئی روشنی' کے دفتر میں آتی تھی، ورنہ میرے پاس ذاکر صاحب کے بیشتر خطوط محفوظ رہتے تھے:

بیمارستان "لاکولین"

جنیوا ۱۶ جون (۴۸ء)

عابد صاحب!

آج شاید بارھواں دن ہے کہ دونوں آنکھیں بند اس بیمارستان میں بستر پر پڑا ہوں۔ کروٹ لینے کی بھی اجازت نہیں۔ اس وقت رات ہے، نہ جانے کیا بجا ہو گا۔ تاریکی اور روشنی کے ادل بدل سے ناآشنا کو اس کا پتا اس ستانے سے چلتا ہے جس میں قریب کا دریا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے کمرے کے نیچے آ گیا ہے اور بس مجھی سے باتیں کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ میں اس کی سنتا رہوں۔ مگر میرا جی چاہتا ہے کہ اس وقت آپ سے باتیں کروں۔ بستر سے لگی ہوئی ایک چھوٹی سی میز ہے جسے چھو سکتا ہوں اور ٹٹول کر اس پر سے چیزیں اٹھا سکتا ہوں۔ اس کی دراز میں آپریشن سے پہلے ایک پنسل اور کاغذ کا ایک پیڈ رکھ دیا تھا وہ اس وقت کام آیا۔ نابینا آنکھوں کے باوجود یہ لکھنے کی پہلی کوشش ہے۔ سطر پہ سطر تو شاید چڑھ جائے مگر کچھ نہ کچھ تو پڑھا جائے گا ضرور!

ایسی حالت میں خط لکھنے کو جی یوں چاہا کہ شام ہوتے آپ کا خط ملا تھا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ شاید نئی روشنی "کو نکل آئے گا۔ ۹ بجے سے جب سونے کا وقت سمجھ کر سب رفیق و مددگار چلے جاتے ہیں، کچھ اسی کا دھیان بندھ جاتا ہے۔ "آج وہ پرچہ نکلا ہوگا اور میں نہ جانے اسے کب دیکھ سکوں گا"، نہ جانے کب اس کے لیے کچھ لکھ سکوں گا؟ یہ پرچہ کیسی پریشانی کے وقت نکلا ہے۔ آپ کے اپنے اور سب کاموں کی طرح اس کی بے سروسامانی کا حال بھی جانتا ہوں۔ چل بھی سکے گا یا نہیں؟ کیا پیر بنانے کا کام کیے بغیر رائے بنانے کا کام ہو سکے گا؟ لوگ اسے غداروں کی سازش سمجھیں گے، یا ساتھیوں، ہمسفروں کی آواز؟ یہ عام مذاق کو سدھار سکے گا یا عام بدمذاقی کا شکار ہو جائے گا؟ یہ حق کی تلخی سے گھبرائے گا تو نہیں؟ نشہ پلا کے لوگوں کو بدحواسی اور بے عقل بنانے کا چلتا کاروبار تو نہیں کرنے لگے گا؟ نہ جانے کیا کیا سوال دل میں اٹھتے ہیں۔ مایوس کن سے مایوس کن خیال دل میں آتا ہے مگر ٹھہرتا نہیں، جمتا نہیں۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ اس وقت کے حالات کا، میرے اپنے ذاتی اور وطن کے عمومی حالات کا تقاضا یاس افزا ہونا چاہیے، اپنے سینے کو امید سے معمور پاتا ہوں۔ آپ کو تعجب ہوگا عابد صاحب کہ ان پچھلے بارہ دنوں میں جاگتے میں مجھے ایک لمحے کو تاریکی کا احساس نہیں ہوا۔ دن ہو یا رات میری بند آنکھیں برابر کمرے کو روشن پاتی ہیں۔ اس روشنی کی کچھ بے ربطیاں بھی محسوس کرتا ہوں۔ مثلاً میرے کمرے کا دروازہ جو میرے بائیں جانب دیوار کے بیچ میں ہے، مجھے دور کونے میں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ روشنی اسی طرح روشن ہے۔ البتہ جیسے دھیمی دھیمی جیسی کھلی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ اس روشنی میں وسیع کھیت دیکھتا ہوں، ہل کی لیکھ صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس کے ایک طرف روشنی، ایک طرف سایہ تک محسوس ہوتا ہے۔ بڑے بڑے مکان بنتے دیکھتا ہوں۔ آس پاس کثرت تعمیر کا سامان۔ [illegible] وجہ مجھے معلوم نہیں، نہ اس کے پتا چلانے کی مجھے فکر ہے۔ آپ سے اس کا ذکر اس لیے کیا کہ حالات کی تاریکی میں میرے دل کا بھی یہی حال ہے۔ اس لیے کہ اس امید کی وجہ بھی صحیح معلوم نہیں۔ غنی کا شعر وجہ نہیں بتاتا لیکن کیفیت کی صحیح تصویر ضرور پیش کرتا ہے:

دلم بکوے تو با صد ہزار نومیدی   بہ این خوش است کہ امیدوار می گزرد

مجھے یقین ہے کہ آزمائش کا یہ وقت بھی گزر جائے گا اور ہندی سماج [illegible] اخلاقی سماج بنانے کا کام آپ جیسے [illegible] ہاتھ ہی کریں گے اور ایک صالح، عادل سماج بنانے کی کٹھن جدوجہد کرنے کی کوشش ہی میں ہم سب کو اپنی شخصیت کو ایک آزاد اخلاقی شخصیت بنانے کا موقع بھی ہاتھ آئے گا۔ اس مہم میں راہ نما روشنی کی ہر قدم [illegible]

پر ضرورت ہوگی۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کا پرچہ یہ روشنی پھیلا کرے، جی کہتا ہے کہ یہ ایسا کرے گا۔ آپ نے اس کا نام "نئی روشنی" خوب رکھا ہے۔ میری دُوری اور بے بسی سے یہ نہ سمجھیے گا کہ اس دیے کی لَو روشن رکھنے کے لیے میں اپنے آپ کو پگھلانے سے بچ نکلوں گا۔ سمجھتا ہوں کہ اب بس کردوں۔ شاید اب صبح ہونیوالی ہے۔ ابھی کچھ دیر ہوئی مرغ نے بانگ دی تھی۔ اب وہ چڑیا بولی جو روز میری کھڑکی کے قریب درخت پر بولتی ہے۔ پہلے ذرا آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر، جیسے آزماتی ہو کہ اور بھی جاگتے ہیں یا نہیں۔ پھر چند منٹ بعد جہاں کوئی اور ہمنوا نہ ملا، تو ذرا جلد جلد اور تیز تیز، کوئی آدھ گھنٹے میں سارا باغ گونج اٹھتا ہے اور نغمے کا ایک ایسا طوفان ہوتا ہے کہ بیان نہیں کرسکتا۔ معلوم ہوتا ہے چڑیاں ہی نہیں درختوں کی ہر پتّی، چمن کا ہر پھول بھی اسی کورس میں شریک ہوگیا ہے۔ مگر جب دن چڑھے آدمیوں کا شور غل، ڈاکٹروں کی آمد، نرسوں کی مستعدی، اس جشن موسیقی کو دبا دیتی ہے اس وقت بھی اس چڑیا کی آواز بار بار آتی ہے، سنائی دیتی ہے، جو پہلے رُک رُک کر، ذرا آہستہ آہستہ بولتی تھی اور آج ایسا لگتا ہے کہ شاید اسی چڑیا ہی کا نام "نئی روشنی" ہے۔ بس، خدا حافظ!

آپ کا : ذاکر

●●

(۱۲ مارچ ۱۹۶۸ء کو خدا بخش لائبریری میں سنایا گیا)

عبدُاللطیف اعظمی

● **جناب عبداللطیف اعظمی :** پیدائش ۱۹۱۰ء، تعلیم: مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ (۳۰-۱۹۲۷ء)، دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) (۳۵-۱۹۳۰ء)، جامعہ ملیہ اسلامیہ (۴۱-۱۹۳۶ء) اور مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔ ڈاکٹر صاحب کے شاگرد اور جامعہ میں ان کے رفیق رہے (۷۰-۱۹۴۹ء)۔ جامعہ میں اپنا زمانہ تصنیف و تالیف، مہتمم کتب خانہ جامعہ، [illegible] ایڈیٹر رسالہ "ہمدرد"، ایڈیٹر رسالہ جامعہ، سکریٹری [illegible] کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ماہنامہ جامعہ کے مدیر معاون ہیں۔ آپ انجمن ترقی اردو دہلی کے ماہنامہ "تعلیم" کے بھی ایڈیٹر رہے اور "صبح" [illegible] [illegible] آزاد اور [illegible] کی تعمیر۔

اہم تالیفات : (۱) شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں (۲) بابائے اردو مولوی عبدالحق (۳) ڈاکٹر ذاکر حسین۔ سیرت و شخصیت (۴) جواہر لال نہرو۔ ایک مطالعہ (۵) گاندھی جی اور ان کے خیالات (۶) سرسید احمد خان اور ان کی شخصیت [illegible] (۷) [illegible] (۸) [illegible] دریائے [illegible]

جس طرح کسی مخصوص خاندان، ماحول، ملک اور زمانے میں کسی شخص کی پیدائش غیر اختیاری اور جبری ہوتی ہے اسی طرح بہت سے لوگوں کی تعلیم بھی غیر اختیاری اور جبری ہوتی ہے، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنی مرضی اور پسند کے مطابق اپنی تعلیم اور درس گاہ کو اختیار یا منتخب کرے۔ زیادہ تر والدین کی مرضی اور خواہش کو ان کی تعلیم اور درس گاہ کے انتخاب میں دخل ہوتا ہے، مگر خوش قسمتی سے مجھے کم از کم اعلیٰ تعلیم کے انتخاب میں آزادی حاصل تھی۔

میرا تعلق یوپی کے ایک زمیندار خاندان سے ہے۔ میرے والد کا میری پیدائش سے قبل ہی ہیضے کی وبا میں عین جوانی میں انتقال ہو گیا، اس لیے والد کے بڑے بھائی نے مجھے تعلیم دلائی — میں، میرے بڑے بھائی اور دوسرے چچا زاد بھائی ان کو یعنی چچا کو ابا کہتے تھے۔ ہماری طرف عام طور پر والد کو ابا کہتے ہیں اور چونکہ ان کی حیثیت والد کی سی تھی، اس لیے سبھی بھائی — چاہے ان کے حقیقی لڑکے ہوں یا ان کے بھتیجے بالتخصیص انھیں ابا ہی کہتے تھے۔ ان میں وہ تمام باتیں موجود تھیں جو ایک زمیندار میں ہوتی تھیں، یعنی سخت قدامت پرست اور کٹر قسم کے مذہبی تھے۔ مذہبی بھی ایسے جنھیں عرفِ عام میں 'وہابی' کہتے ہیں۔ انھوں نے خاندان کے کچھ بچوں کو انگریزی تعلیم دلائی اور کچھ کو مذہبی تعلیم، میں ان لوگوں میں سے تھا جن کو عربی مدرسے میں بھیجا گیا۔ جو انگریزی تعلیم حاصل کرتے تھے، ان سے وہ توقع رکھتے تھے کہ آگے چل کر وہ یا تو ایڈووکیٹ ہوں گے یا منصف اور جج اور جو مذہبی تعلیم حاصل کرتے تھے، ان کو ایک بہت بڑا عالم دیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے ضلع اعظم گڑھ کی مشہور درس گاہ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) میں حاصل کی تھی۔ تین چار سال کے بعد ملک کی مشہور عربی و مذہبی تعلیم گاہ 'دارالعلوم ندوۃ العلما' (لکھنؤ) چلا گیا، وہاں عالم کا امتحان پاس کرنے کے بعد 'فاضل' کے آخری سال میں پڑھ رہا تھا کہ بعض مخصوص حالات کی بنا پر ندوہ کو چھوڑنا پڑا۔ ابا چاہتے تھے کہ عالم اسلام کی مشہور مذہبی یونیورسٹی جامعہ ازہر (مصر) چلا جاؤں، چنانچہ میں نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دیدی، مگر اسی درمیان میں مولانا

حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری سے ملاقات ہوئی، جو گرمیوں کی تعطیلات میں گھر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے علی گڑھ جانے کے بجائے جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ دہلی جانے کے بعد تم کو خط لکھوں گا۔ چنانچہ جامعہ سے ان کا خط آیا کہ تمہارا داخلہ ہو گیا ہے، جلد سے جلد آ جاؤ۔ ابا کو جب معلوم ہوا کہ جامعہ ملیہ کو حکومت تسلیم نہیں کرتی اور اس کے فارغ التحصیل طلبا کو سرکاری ملازمت نہیں ملتی، تو انھوں نے فرمایا کہ ایسی تعلیم سے کیا فائدہ جس سے نہ تو دین ملے اور نہ دنیا ملے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کے نو بیٹے ہیں (یعنی بھتیجے وغیرہ ملا کر)، ایک بیٹے کو زکوٰۃ کے طور پر قوم کو دیدیجئے۔ مذہبی آدمی تو تھے ہی، زکوٰۃ والی بات شاید دل میں بیٹھ گئی، چنانچہ اجازت دیدی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود میں نے جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے پر اس قدر اصرار کیوں کیا، جبکہ میری تمام تعلیم و تربیت مذہبی فضا میں ہوئی تھی اور میرا خاندانی ماحول بھی انتہائی قدامت پسند تھا اور نہ میں نے جامعہ دیکھی تھی اور نہ اس کے کسی استاد سے، مولانا اسلم جیراجپوری کے علاوہ، اُس وقت تک ملا تھا۔ اس کی وجہ صرف جامعہ کے رسالے، پیام تعلیم اور جامعہ تھے اور اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھی ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب تھے۔ ان رسالوں اور ان اساتذہ سے میں بے حد مرعوب اور بن دیکھے ان تینوں شخصیتوں کا گرویدہ تھا، بالخصوص ذاکر صاحب کا۔

جب جامعہ پہنچا تو وہ پسند نہیں آئی۔ کالج میں بہت کم طالب علم تھے اور ان میں اچھی خاصی تعداد جاوی طالب علموں کی تھی اور ان کا علمی و ادبی معیار پست تھا۔ ہوسٹل میں سب سے پہلے جن استاد سے ملاقات ہوئی وہ ہکلے تھے اور جب کلاس میں گیا تو وہاں سب سے پہلے جن اُستاد سے واسطہ پڑا، وہ بھی ہکلے نکلے۔ دل میں خیال آیا کہ جامعہ نے صرف ہکلوں کو بھر رکھا ہے، مگر بعد میں جامعہ کا کچھ ایسا اسیر ہوا کہ پوری زندگی صرف اسی کی ہو کر رہ گئی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی "علی گڑھ پرستی" اور ذاکر صاحب کے جا و بیجا ذکر اور ان کی تعریف کی وجہ سے خوش نام اور یہ راقم الحروف جامعہ ملیہ اور ذاکر صاحب، دونوں کی جا بیجا مدافعت کی وجہ سے بہت زیادہ بدنام ہے۔ ظاہر ہے، میرا اور رشید صدیقی صاحب کا کیا مقابلہ، مگر ذاکر صاحب اور اپنی اپنی محبوب درسگاہوں کے معاملے میں، ایک نیک نامی اور دوسرا بدنامی میں، یکساں شہرت رکھتے ہیں۔

جامعہ آنے سے پہلے میں صرف ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب سے واقف تھا، مگر یہاں آنے کے بعد ایک اور دلچسپ، دلکش اور انتہائی مخلص اور ایثار پیشہ شخصیت کا اضافہ ہوا، وہ تھے

Acc. No. 21241
6.9.82

شفیق الرحمٰن قدوائی۔ دراصل جامعہ ملیہ اسلامیہ ان ہی چار شخصیتوں کا مجموعہ تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ نہ ہوتے تو جامعہ ملیہ بھی نہ ہوتی اور نہ وہ بنتی، جو بعد میں بنی۔ اس کے ساتھ اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان کے سردار اور جامعہ کے حقیقی قائد و رہنما ذاکر صاحب ہی تھے۔ جامعہ کے بانی تو بہت سے ہیں، ان میں ذاکر صاحب کا بھی شمار ہوتا ہے مگر اس کا حقیقی معمار اگر کوئی ہے تو وہ ذاکر صاحب ہیں۔

ابھی پٹنہ آنے سے ایک دو روز قبل اور آج کے مضمون کے لیے بیدار صاحب کے دعوت نامہ ملنے کے بعد، اتفاقیہ طور پر ایک جگہ پروفیسر مجیب صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ یہ تو غالباً آپ لوگ جانتے ہی ہوں گے کہ جن چار شخصیتوں کا مجموعہ میں نے جامعہ ملیہ قرار دیا ہے ان میں اب صرف مجیب صاحب حیات ہیں، باقی تین اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس ملاقات میں، جہاں جامعہ کے چند اور حضرات تھے، اسموکنگ کا ذکر آگیا۔ میں نے مجیب صاحب سے پوچھا کہ آپ پہلے سگار بہت پیتے تھے اور اب ڈاکٹر کی ہدایت پر چھوڑ دیا ہے، مگر کبھی کبھی سگریٹ پیتے ہیں، لیکن کبھی ہم نے ذاکر صاحب کو سگریٹ یا سگار پیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کیا یورپ میں بھی اسموکنگ کا شوق نہیں رکھتے تھے یا بعد میں، جامعہ کے ماحول اور حالات کی وجہ سے چھوڑ دیا؟ یہ مجلس خاصی بے تکلف اور غیر سنجیدہ تھی۔ ذاکر صاحب کا نام آتے ہی مجیب صاحب سنجیدہ ہوگئے، اور فرمایا: ارے وہ؟ وہ تو صحیح معنی میں سردار تھے، واقعی بڑے آدمی تھے، اسموکنگ کو بہت برا سمجھتے تھے، شراب کا تو تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، دلآویز شخصیت کے مالک تھے، ان کی گفتگو میں بھی بڑی دلکشی ہوتی تھی، لیکن عورتوں سے ملنے جلنے میں بڑی احتیاط برتتے تھے اور ان سے بہت زیادہ خلط ملط کو پسند نہ کرتے تھے۔

میں نے طالب علمی کے زمانے میں، خاص طور پر، محسوس کیا ہے کہ وہ نصیحت یا پند و وعظ کے قائل نہ تھے، وہ طالب علموں میں جو بات پیدا کرنی چاہتے تھے، اس کو اپنے عمل سے ان کے دلوں میں جاگزیں کرنے کی کوشش کرتے۔ مثلاً کالج کی عمارت میں ایک اتحادی دوکان تھی، وقفے (انٹرول) میں طالب علم اس سے ٹافی وغیرہ خرید کر کھاتے اور اس کا کاغذ وہیں پھینک دیتے۔ ذاکر صاحب کو یہ بات بہت ناپسند تھی، مگر زبان سے کبھی کچھ نہ کہتے بلکہ جب کبھی اُدھر سے گزرتے، تمام کاغذ چن چن کر اٹھاتے اور ردّی کے ٹین میں ڈال دیتے۔ ان کے اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کوئی طالب علم کوئی ردّی چیز سڑک پر یا دوکان کے سامنے پھینک دیتا، تو دوسرے طالب علم اس کو ٹوکتے اور اگر وہ خود نہ اٹھاتا تو دوسرے طلبا اٹھا کر ردّی کے ٹین میں ڈال دیتے۔ اسی طرح کی ایک اور مثال لیجیے۔ ان کا مکان، کالج کے ہوسٹل کے بالکل پاس تھا، صرف ایک گلی دونوں کے

درمیان حدِّ فاصل تھی۔ طالب علموں کی مذہبی زندگی کیسی ہوتی ہے، خصوصاً نماز کی پابندی وہ کس حد تک کرتے ہیں، مجھے معلوم نہیں کہ آپ لوگوں میں سے کتنے لوگوں کو اس کا تجربہ یا مشاہدہ ہے۔ مگر میں نے دو عربی اور مذہبی درسگاہوں کے ہوسٹل میں ۸۔۱۰ سال زندگی گزاری ہے اور دو سال مسلم یونیورسٹی کے ہوسٹل میں اور پانچ سال جامعہ کے ہوسٹل میں۔ ان میں سے سبھی کی حالت قریب قریب یکساں ہے، میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بھی اپنے شوق سے نہیں پڑھتا، صرف احتساب اور سزا کے ڈر سے پڑھتا ہے، اِلّا ماشاءاللہ۔ ذاکر صاحب اس معاملے میں بھی اپنی زبان سے کچھ کہے بغیر، محض اپنے عمل سے طالب علموں میں احساس پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اکثر خاص طور پر صبح کی نماز کے وقت، چپکے سے نماز کے ہال میں آکر بیٹھ جاتے تھے، بس پھر کیا ہے، ہر طرف بھاگ دوڑ شروع ہوجاتی تھی اور لوگ بستروں سے اٹھ اٹھ کر ہال کی طرف دوڑ پڑتے۔ ایک مرتبہ ہوسٹل کے صحن میں ہم لوگ تاش کھیل رہے تھے، وہ اپنے مکان سے نکل کر ادھر سے گزر رہے تھے، اتفاق سے نظر پڑ گئی اور صحن میں آگئے۔ ہم سب گھبرا کر اُٹھ گئے، اُنہوں نے کسی قسم کی خفگی یا تنغص کا اظہار کیے بغیر فرمایا: کھیلئے، کھیلئے، افسوس کہ مجھے نہیں آتا، ورنہ میں بھی شریک ہوجاتا۔ ان کے اس ارشاد پر ہمیں اس سے کہیں زیادہ شرمندگی ہوئی، جتنی کسی نصیحت یا خفگی سے ہوتی۔

نماز کا ذکر آگیا ہے تو اس سلسلے کی کئی باتوں کا ذکر کردوں۔ میرا تعلق ذاکر صاحب سے تقریباً بارہ سال رہا ہے، اس میں سے پانچ سال بحیثیت طالب علم کے اور سات سال بحیثیت کارکن جامعہ کے۔ اس کے بعد ذاکر صاحب جامعہ سے چلے گئے، مگر جامعہ آتے رہے اور ملاقات ہوتی رہی۔ اس بارہ سال کی مدت کے بارے میں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پابندی سے نماز پڑھتے تھے اور شعائر اسلام کا بیحد احترام کرتے تھے، مگر غلو سے کبھی کام نہ لیتے، ایسی باتوں سے بچتے، جس سے ریاکاری کا شبہ ہو، اور عبادت کو اپنی شہرت اور دوسروں کی زحمت کا باعث نہ بناتے۔ ایک مرتبہ، جب وہ نائب صدر جمہوریہ تھے، جامعہ کے کسی جلسے میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ جلسے کے بعد جانے لگے، تو مجیب صاحب نے چائے کے لیے اصرار کیا، انھوں نے معذرت کی اور فرمایا کہ بہت ضروری کام ہے، میرا جانا ضروری ہے، اسی درمیان میں زیدی صاحب آگئے (کرنل بشیر حسین زیدی) اور ان سے کچھ باتیں ہونے لگیں، یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مغرب کی اذان ہوگئی، اسی وقت جانے کا ارادہ ملتوی کردیا اور نماز میں شریک ہوگئے۔ میرا ذاتی احساس ہے کہ کوئی دوسرا ہوتا تو چلا جاتا اور مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ کوئی کچھ نہ کہتا، وہاں کوئی مولانا ماجد نہیں تھا، مگر ان کے ضمیر نے گوارا نہیں کیا کہ اذان کے بعد وہ بغیر نماز ادا کیے وہاں

سے چلے جائیں۔ نائب صدر جمہوریہ ہی کے زمانے کا ایک اور واقعہ ہے۔ مجھے تو نائب صدر جمہوریہ ہی مگر ڈاکٹر ذاکر حسین دلی سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ذاکر صاحب ان کے قائم مقام تھے۔ ذاکر صاحب نے اپنے نائب صدر جمہوریہ کی مدت میں بارہا قائم مقام کی حیثیت سے فرائض انجام دیے ہوں گے، مگر یہ پہلا موقع تھا کہ وہ قائم مقام کی حیثیت سے راشٹرپتی تھے۔ جب جمعہ کا دن آیا تو غالباً کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ وہ جمعہ کی نماز دلی کی جامع مسجد میں ادا کریں۔ مشورے کی بات میں نے اس لیے کہی ہے کہ اس میں ظاہرداری کا نمایاں پہلو ہے اور یہ بات ذاکر صاحب کے مزاج اور طبیعت کے خلاف ہے۔ ممکن ہے یہ مشورہ زیدی صاحب نے دیا ہو یا کم از کم مشورہ دینے والوں میں رہے ہوں، کیونکہ راشٹرپتی بھون سے زیدی صاحب ہی کا جامعہ فون آیا تھا کہ ذاکر صاحب جامع مسجد میں جمعہ پڑھ رہے ہیں، لوگوں کے ہجوم سے بچانے کے لیے جامعہ کے کچھ لوگ وہاں پہنچ جائیں۔ جو لوگ جامعہ سے گئے تھے، ان میں ایک یہ خاکسار بھی تھا۔ وہاں جانے کے بعد معلوم ہوا کہ جامع مسجد کا مشرقی دروازہ عام پبلک کے لیے بند کر دیا گیا ہے، صرف ذاکر صاحب اس سے داخل ہوں گے۔ ہم نے ذاکر صاحب کی جگہ کے لیے یہ انتظام کیا تھا کہ پہلی صف میں، عین پیش امام کے پیچھے، جامعہ کے بہت سے لوگوں کو بٹھا دیا تھا تاکہ جب وہ آجائیں تو ان کو جگہ دیدیں۔ مشرقی دروازے پر ذاکر صاحب کے خیرمقدم کے لیے پیش امام صاحب بنفس نفیس موجود تھے، ان کے ساتھ میں بھی موجود تھا، وہ دروازے کے اندر تشریف رکھتے تھے اور میں باہر زینے پر کھڑا تھا، باہر سڑک پر انتظام کے لیے پولیس تھی۔ عام لوگوں کو شاید سرکاری انتظام کا علم تھا یا پولیس کے اشاروں پر لوگ جنوبی اور شمالی دروازوں سے مسجد میں، بہت ہی سکون کے ساتھ آرہے تھے۔ مگر حافظ علی بہادر خاں صاحب خاص طور پر مشرقی دروازے کی طرف بڑھے۔ ان کے لیے قریب ترین راستہ شمالی دروازہ تھا، لیکن ان کا مقصد تو سرکاری انتظام کی خلاف ورزی تھا، اس لیے قریب کا راستہ چھوڑ کر انھوں نے دور کا راستہ اختیار کیا۔ ممکن ہے پولیس نے ان کو نرمی کے ساتھ روکنے کی کوشش بھی کی ہو، لیکن جب انھوں نے ایک خاص مقصد کے ساتھ ایک ارادہ کر لیا تھا، تو سختی کے ساتھ انھیں روکنے میں بدمزگی پیدا ہونے کا امکان تھا، اس لیے بغیر کسی روک ٹوک کے وہ مشرقی دروازے سے مسجد میں داخل ہوئے۔ ذاکر صاحب نے حسب پروگرام نماز ادا کی، مگر نماز بعد، تمام انتظامات کے باوجود، واپسی میں بڑی دقت پیش آئی؛ ہر شخص ان کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا اور بہت سے لوگ مصافحہ کرنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ اس کے بعد اردو اخبارات کے ایک مخصوص حلقے میں بڑی لے دے ہوئی۔ کسی نے لکھا کہ مسجد کی بے حرمتی ہوئی اور عین نماز کے وقت فوٹو لیے گئے، کسی نے اعتراض کیا کہ مشرقی دروازہ، عام نمازیوں کے لیے بند کر کے مداخلت فی الدین

کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ذاکر صاحب نے دار المصنفین اعظم گڑھ کی جوبلی کے موقع پر، مغرب کی نماز، صحن کے آخری حصے میں نمازیوں کے جوتوں کے قریب ادا کی تھی، اس وقت بھی وہ نائب صدر جمہوریہ تھے اور نماز میں اس وقت پہنچے تھے جب جماعت کھڑی ہو گئی۔ مولانا عبد الماجد صاحب نے لکھا کہ ہم تو قائم مقام صدر جمہوریہ سے یہی توقع رکھتے تھے کہ اعظم گڑھ کی طرح؟ جہاں انھیں جگہ مل جاتی وہیں نماز ادا کر لیتے، چاہے وہ جامع مسجد کی سیڑھیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ میں نے دِلّی کے اخبارات کے اعتراضات کا تفصیل سے جواب لکھا تھا جو روزنامہ 'الجمعیۃ' میں چھپا تھا، فوٹو کے بارے میں لکھا تھا کہ میں نے خود اوّل صف میں نماز ادا کی ہے، نماز کے دوران کوئی فوٹو نہیں لیا گیا، ثبوت یہ دیا تھا کہ کسی اخبار میں کوئی ایسا فوٹو شائع نہیں ہوا ہے جو نماز کے دوران لیا گیا ہو، جتنے فوٹو شائع ہوئے ہیں، وہ اس وقت کے ہیں جب وہ مسجد میں یا تو داخل ہو رہے ہیں یا نماز کے بعد واپس آ رہے ہیں اور ہجوم ان کو دیکھنے یا ان سے ہاتھ ملانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس واقعہ کے بعد جہاں تک مجھے معلوم ہے انھوں نے دوبارہ جامع مسجد میں نماز ادا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ عیدین کی نماز وہ ہمیشہ جامعہ میں پڑھا کرتے تھے۔ آخری نماز جو انھوں نے ادا کی ہے، وہ بیٹھ کر پڑھی ہے، کیونکہ ان کے گھٹنے میں درد تھا، کھڑے ہو کر پڑھنا ممکن نہ تھا اور مجیب صاحب کے ارشاد ان کی بغل میں ایک سطر میں بھی تھا۔

ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو: ذاکر صاحب آسام کے سرکاری دورے پر تشریف لے گئے تھے، مجھے اس وقت یہ یاد نہیں کہ اس وقت وہ نائب صدر جمہوریہ تھے یا صدر جمہوریہ۔ میرے ایک کلاس فیلو اس ریاست کی جماعت اسلامی کے امیر تھے۔ انھوں نے ایک موقع پر، میری موجودگی میں، ذاکر صاحب سے شکایت کی کہ وہ نماز جمعہ کے لیے مسجد تشریف نہیں لائے۔ ان کے جواب میں پہلی بات یہ کہی کہ میں مسافر تھا، جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرائض میں داخل نہیں ہے، دوسری بات یہ فرمائی کہ میرے گھٹنے میں درد تھا، یہ مجبوری بھی تھی۔ میرے دوست اور ساتھی نے فرمایا کہ آپ بیٹھ کر پڑھ لیتے۔ انھوں نے فرمایا کہ لوگوں کے سوالات کے جوابات کہاں تک دیتا" اور نہ جانے مطمئن بھی کر پاتا یا نہیں۔ میرے خیال میں انھوں نے شرعی عذر محض ریاستی امیر جماعت اسلامی کے خیال سے فرما دیا، ورنہ اصل وجہ وہی رہی ہوگی جو انھوں نے بعد میں کہی تھی۔

ذاکر صاحب کا خصوصی مضمون معاشیات تھا اور وہ مشہور ہوئے ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے، اگر میرے خیال میں ان دونوں خصوصیات کے علاوہ ان میں ایک اور خصوصیت تھی جسے ماہرِ نفسیات کے لفظ سے ادا کر سکتے

ہیں۔ وہ انتہائی ذہین تھے اور ان کی نظر بڑی دور رس تھی۔ کوئی جاننے والا ان سے ملنے کے لیے آتا تو اظہار مدعا سے پہلے ہی عموماً اس کا مقصد سمجھ جاتے اور اگر کوئی نیا شخص ہوتا تو ایک دو جملے کے بعد ہی اصل غرض سمجھ جاتے اور اسی لحاظ سے گفتگو کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیتے۔ اگر ملنے والا جامعہ کا طالب علم یا اُستاد یا کارکن ہوتا تو عام طور پر وہ اپنی گفتگو میں مخالف پہلو اختیار کر لیتے اور ایسی بحث کرتے کہ آدمی زچ ہو جاتا۔ ایک واقعہ ہے کہ طلباء کالج کی یونین، انجمن اتحاد کا سالانہ جلسہ تھا۔ میں جس پارٹی سے تعلق رکھتا تھا، وہ الکشن میں کامیاب ہوئی تھی، میں سکریٹری منتخب ہوا تھا اور میرے ایک دوسرے ساتھی علوی صاحب صدر۔ اس سے پہلے ہم لوگوں کا تعلق حزب اختلاف کی حیثیت سے تھا۔ اس لیے زیر تذکرہ سالانہ جلسے میں ہم لوگوں نے خوب خوب اعتراضات کیے اور کوشش کی کہ سالانہ رپورٹ منظور نہ ہو۔ ذاکر صاحب بحیثیت شیخ الجامعہ جلسے کے صدر تھے، انھوں نے ہماری ایک بھی چلنے نہ دی۔ مجھے اور منتخب صدر علوی صاحب کو اسی رات کو ایک آل انڈیا ڈبیٹ میں شرکت کے لیے علی گڑھ جانا تھا۔ ہم نے جب دیکھا کہ خواہ مخواہ کی تاخیر ہو رہی ہے، جب تک اعتراضات کا سلسلہ جاری رہے گا ہم اپنی گاڑیاں سنبھال نہ سکیں گے، دوسرے اگر بہت تاخیر ہوئی تو ہماری ٹرین چھوٹ جائے گی، اس لیے یکلخت ہم نے اپنا رویہ بدل دیا۔ ذاکر صاحب فوراً سمجھ گئے اب تک وہ اعتراضات کی حوصلہ شکنی کر رہے تھے، اب اعتراضات کے لیے دعوت دینے لگے۔ ہم نے گھبرا کر عرض کیا کہ جلسے میں خواہ مخواہ کے لیے دیر ہو رہی ہے رپورٹ کے بارے میں اب کوئی خاص بات کہنے کے لیے نہیں بچی، کہنے لگے اب تک کہنے کے لیے کونسی بات تھی کہ آپ لوگ خواہ مخواہ کی رکاوٹیں ڈال رہے تھے۔ بہرحال رپورٹ منظور ہوئی، نئے صدر نے اپنا خطبہ پڑھا، میں نے نئے سکریٹری کی حیثیت سے حاضرین جلسہ اور صدر جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا۔ جب ہم لوگ وہاں سے روانہ ہونے لگے، تو ذاکر صاحب نے مجھے بلا کر فرمایا کہ علوی کے پاجامے کی میانی پھٹی ہوئی ہے، ان سے کہیے کہ پاجامہ بدل لیں، ورنہ علی گڑھ کے طلبا بڑا مذاق اڑائیں گے۔

یہ واقعہ تو اس وقت کا ہے جب ہم لوگ یونین میں برسر اقتدار آ گئے تھے۔ اب ایک واقعہ اس وقت کا سنیے، جب ہم اقتدار سے الگ رہے تھے، اس سے ذاکر صاحب کی سوجھ بوجھ اور تدبر کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرے ایک دوست اور کلاس فیلو ہم سے پہلے یونین کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے اور کسی بات پر خفا ہو کر یونین بیٹھنے کے بعد ہی، ہماری خواہش کے علی الرغم استعفا دے دیا۔ اب ہم لوگ دوبارہ ان کو سکریٹری بنانا چاہتے تھے، مگر یونین کے دستور کے مطابق سکریٹری کے عہدہ کے لیے وہ امیدوار نہیں ہو سکتے تھے، البتہ صدر کے عہدے

کے لیے کھڑے ہو سکتے تھے، مگر اس کے لیے ان کی کامیابی کی امید نہیں تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ دستور میں ایسی تبدیلی کر دی جائے کہ سکریٹری کے عہدے کے لیے وہ الکشن میں کھڑے ہو سکیں۔ دستور میں دو دفعات تھیں، ایک یہ کہ جو سکریٹری کم از کم چھ ماہ کام کرے گا، وہ یونین کا لائف ممبر ہوگا، دوسری دفعہ تھی کہ جو شخص ایک مرتبہ سکریٹری منتخب ہو چکا ہے، وہ دوبارہ سکریٹری کے عہدے کے لیے امیدوار نہیں ہو سکتا، صرف صدارت کے لیے امیدوار ہو سکتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ دوسری دفعہ کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص لائف ممبر ہو گیا ہے، وہ دوبارہ سکریٹری کے عہدے کے لیے الکشن نہیں لڑ سکتا۔ مگر اس دفعہ کے الفاظ اس مطلب کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، اس لیے مجھے یقین تھا کہ الکشن کے موقع پر ہمارے دوست کا نام سکریٹری کے لیے نامنظور ہو جائے گا، اس لیے الکشن سے پہلے ان دونوں دفعات میں مناسب ترمیم ضروری تھی مگر دقت یہ تھی کہ ہاؤس میں ہماری اکثریت اقلیت میں بدل گئی تھی اس لیے کوئی اہم ترمیم ہاؤس سے منظور کرانا مشکل تھا، مگر اس کے علاوہ اور کوئی شکل بھی نہیں تھی، اس لیے ہم نے ہمت کر کے دستور پر نظر ثانی کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کے لیے ہاؤس میں تجویز رکھی۔ چالاکی یہ کی کہ کمیٹی میں مخالفین کی تعداد زیادہ رکھی تاکہ کسی کو کوئی شبہ نہ ہو اور یہ تجویز اور کمیٹی دونوں منظور ہو جائیں۔ ہاؤس میں نظر ثانی کی تجویز کی مخالفت کی گئی، مگر میری احتیاط کام آئی اور دونوں تجاویز منظور ہو گئیں۔ کمیٹی کا کنوینر ظاہر ہے میں، صدر مخالف گروپ کا رکھا اور اراکین میں بھی ان ہی کی اکثریت تھی۔ میں نے نظر ثانی شدہ دستور کا مسودہ تیار کر کے کمیٹی میں پیش کیا اور اس کے بعد ہاؤس میں پیش ہوا اور بالآخر منظور ہو گیا۔ میں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ مذکورہ بالا دونوں دفعات کو باقی رکھتے ہوئے اس اضافے کے بعد ان کا تضاد دور کر دیا کہ: بہ شرطیکہ سکریٹری لائف ممبر ہو گیا ہو۔ اس طرف کسی کا ذہن نہیں گیا اور جوں کا توں دستور منظور ہو گیا۔ مگر ابھی مشکل باقی تھی، وہ یہ کہ چھ ماہ کے اندر اندر ہاؤس کا کوئی فیصلہ بدلا جا سکتا تھا۔ الکشن کا زمانہ آ گیا اور چھ ماہ کی مدت ابھی باقی تھی، اس لیے میں نے اس ترمیم کا کسی سے ذکر نہیں کیا اور حزب خلاف سے کوشش کرتا رہا کہ وہ میرے دوست کی تجویز پر اعتراض نہ کریں، مگر وہ لوگ تیار نہیں ہوئے، بالآخر ہاؤس میں نئے انتخابات کے لیے تجاویز پیش ہوئیں اور جب اس تجویز پر اعتراض کیا گیا تو ہم نے عرض کیا کہ دستور کی ترمیم شدہ دفعہ کے مطابق اگر کوئی شخص لائف ممبر نہ ہوا ہو تو وہ امیدوار ہو سکتا ہے۔ جب لوگوں کو اس ترمیم کا علم ہوا تو لوگوں نے دستور کی اس ترمیم پر دوبارہ غور کرنے کے [ہا]ؤس کا جلسہ بلانے کا مطالبہ کیا، ہم نے بلانے سے انکار کر دیا۔ اب لوگوں نے شیخ الجامعہ سے درخواست کی۔ اس [وق]ت ذاکر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور پروفیسر محمد مجیب صاحب قائم مقام شیخ الجامعہ تھے۔ مجیب صاحب

نے بحیثیت شیخ الجامعہ حکم دیا کہ ہاؤس کا جلسہ بلایا جائے اور قاعدے کے مطابق ترمیم پر دوبارہ غور کرنے کا موقع دیا جائے۔ ہم نے اس حکم کو ماننے سے انکار تو نہیں کیا مگر جلسہ بھی نہیں بلایا۔ اس عرصے میں ذاکر صاحب واپس آ گئے اور ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا۔ اب دونوں بزرگوں کے سوچنے کا فرق ملاحظہ ہو، مجیب صاحب نے دستور کے صرف الفاظ دیکھ کر ایک حکم دیا اور جمہوریت کی اسپرٹ پر غور نہیں کیا اور ذاکر صاحب نے جمہوریت کی روح اور مقصد کو سامنے رکھ کر ایک فیصلہ کیا۔ انھوں نے دو باتیں فرمائیں : ایک یہ کہ واقعی ان دونوں دفعات میں تضاد تھا اور اس کو دور کرنا ضروری تھا؛ انھوں نے مزید فرمایا کہ اگر ایک شخص سکریٹری منتخب ہو گیا، مگر مدت پوری نہ کرنے کی وجہ سے وہ لائف ممبر نہیں ہو سکا، تو آخر وہ دوبارہ الکشن میں امیدوار ہونے سے کیوں محروم کر دیا جائے۔ دوسری بات انھوں نے یہ فرمائی کہ یہ ترمیم کسی شخص کو منتخب نہیں کرتی صرف کھڑے ہونے کا حق دیتی ہے، اگر اکثریت کسی شخص کو سکریٹری بنانے کے لیے تیار نہیں ہے تو وہ بہرحال منتخب نہیں ہوگا۔ ان دو مختلف رولنگ میں جو بنیادی فرق ہے اس سے دو عظیم شخصیتوں کے طریقِ فکر کا اندازہ کر سکتے ہیں؛ جہاں تک میرا سوال ہے، دونوں میرے استاد ہیں اور میرے لیے دونوں یکساں محترم اور معزز۔

ذاکر صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ لوگوں کے اعتراضات کا جواب نہیں دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے اس سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلتا، بلکہ ضد اور بدمزگی میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں جب بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم شائع ہوئی جسے عرفِ عام میں "وردھا اسکیم" کہتے ہیں، تو ذاکر صاحب اور جامعہ پر مسلم لیگ کی طرف سے سخت اعتراضات کیے گئے، مگر ذاکر صاحب بالکل خاموش رہے اور جامعہ کے لوگوں کو سخت ہدایت کر دی کہ کوئی شخص جواب نہ دے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو بھی اعتراض کیا جائے، اس پر غور ضرور کرنا چاہیے؛ اگر کوئی اعتراض صحیح ہو تو اسے مان لینا چاہیے، مگر بحث سے بچنا چاہیے۔ جس طرح پورے ملک میں یہ اسکیم مابہ النزاع تھی، اسی طرح جامعہ کے طلبا اور اساتذہ میں بھی تھی۔ اُس زمانے میں غلام احمد پرویز صاحب "طلوع اسلام" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ نکالتے تھے، اس میں انھوں نے وردھا اسکیم کے خلاف مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور انھیں اور ان کے حلقے کو شکایت تھی کہ اگر یہ اعتراضات غلط ہیں تو ذاکر صاحب جواب کیوں نہیں دیتے۔ اسی طرح کی باتیں جامعہ کے وہ طالب علم بھی کہتے تھے جن کے والدین پرویز صاحب کے حلقے اور حکومتِ ہند کے سکریٹریٹ سے تعلق رکھتے تھے اور مجھ جیسے لوگ ذاکر صاحب کے اس خاص فلسفے سے متفق نہیں تھے؛ اس لیے میں نے پرویز صاحب کے اعتراضات کے جواب میں ایک طویل مضمون لکھا اور وہ حضرت جوش کے ماہانہ رسالہ "کلیم" میں

شائع ہوا۔ میں نے یہ مضمون یہ سمجھ کر لکھا تھا کہ پرویز صاحب ایک طالب علم کا جواب نہیں دیں گے۔ ذاکر صاحب نے ایک روز مجھے دیکھ لیا تو بلا کر فرمایا کہ اس مضمون کی ضرورت کیا تھی، اس طرح کی بحثوں میں اُلجھنا نہیں چاہیے، اس کے علاوہ اعتراض کرنے والوں کو مخالفت کو جاری رکھنے کا موقع ملتا ہے، اگر آپ جواب میں ایک صفحہ لکھیں گے وہ دس صفحے لکھیں گے، آپ خاموش رہیں گے تو کچھ دنوں میں وہ بھی خاموش ہو جائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اطمینان رکھیں کہ پرویز صاحب مجھ جیسے چھوٹے آدمی کو جواب نہیں دیں گے اور مجھے اپنے ساتھی طالب علموں کو خاموش کرنے کے لیے یہ مضمون لکھنا ضروری تھا۔

ذاکر صاحب میں مروّت بہت تھی، اتنی زیادہ کہ کبھی کبھی محض مروّت میں وہ کر گزرتے جو ان کے اصول اور طبیعت کے بالکل خلاف ہوتا۔ دلّی میں ایک مشہور انجینئر تھے، جنھوں نے دلّی کے فسادات کے بعد ریلیف کے کاموں میں ذاکر صاحب کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس زمانے میں بھی جب لوگ ان کے خلوص پر شبہہ کرتے تو ذاکر صاحب کہا کرتے کہ میں ان سے اچھی طرح واقف ہوں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی ایک جیب میں پاسپورٹ اور دوسری جیب میں پاکستان کا ویزا تیار رکھا رہتا ہے، وہ کسی وقت بھی پرواز کر سکتے ہیں، اگر جب تک وہ اس کٹھن کام میں ساتھ دے رہے ہیں میں انکار کیسے کر سکتا ہوں۔ بعد میں انھوں نے اپنی اس "خدمت" کی دل کھول کر منھ مانگی قیمت وصول کرنی شروع کی تو اس سے ذاکر صاحب پریشان بھی ہوئے اور ان کی اچھی خاصی بدنامی بھی ہوئی، مگر جب ان کے بے تکلف دوست احباب ذاکر صاحب سے اس کی شکایت کرتے تو فرماتے: "اچھوں کے تو سب ساتھی ہوتے ہیں، بُروں کا بھی تو کوئی ہو۔"

ذاکر صاحب کے پاس سفارش کے لیے بہت سے لوگ آتے؛ ان کے ساتھ ان کا سلوک یا جواب کبھی کچھ ہوتا، کبھی کچھ، مگر عموماً ان کی مدد کرتے۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے ایک دوست کے لیے سفارش کی جنھوں نے دلّی کی ایک جگہ کے لیے درخواست کی تھی اور ذاکر صاحب اس کی سلکشن کمیٹی کے چیرمین ہوا کرتے تھے۔ میں نے امیدوار کے بارے میں کہا تھا کہ وہ بہت قابل ہیں۔ ذاکر صاحب نے فرمایا کہ آپ کا امیدوار یقیناً اتنا ہی قابل ہوگا، جتنا آپ نے فرمایا ہے، مگر دعا کیجیے کہ دوسرے امیدوار گدھے ہوں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی امیدوار آپ کے امیدوار سے بھی زیادہ قابل ہو۔ ایک صاحب نے جو میرے ہم وطن اور علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے، ذاکر صاحب کی وائس چانسلر شپ کے زمانے میں علی گڑھ سے ایم۔ ایس سی کیا تھا، انھوں نے ذاکر صاحب سے، جب وہ نائب صدر جمہوریہ تھے، یہ شکایت کی کہ فلاں پوسٹ کے لیے ان کا سلکشن ہو گیا تھا، مگر محض تعصب کی بنا پر

میں مجھے ان فٹ کر دیا گیا، اگر آپ فلاں سے اشارۃً بھی فرما دیں تو میرا بگڑا ہوا کام بن سکتا ہے، ذاکر صاحب نے پوری شدت سے ان صاحب کے کہنے سے انکار کر دیا۔ وہ جذبات میں بہت کچھ کہہ دیتے تھے۔ اگر مخاطب جامعہ کا یا علی گڑھ کا طالب علم رہ چکا ہو۔ یہ صاحب بہت مایوس آئے اور ہر ایک سے ذاکر صاحب کی برائی کرتے تھے، مگر ذاکر صاحب نے کیا کیا؟ انھیں یہ بات یاد تھی، جب متعلقہ افسر سے کسی موقع پر ملاقات ہوئی تو صرف اس قدر فرمایا کہ ذرا فلاں معاملے کو دیکھ لیجیے گا، اس کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی۔ اتنا اشارہ ہی کافی تھا، ان کا کام بن گیا۔ ایک صاحب ذاکر صاحب کے پاس سفارش کے لیے آئے، اس وقت ذاکر صاحب کو سخت بخار تھا اور موسم بھی اچھا نہیں تھا۔ انھوں نے ذاکر صاحب سے ملنے کی خواہش کی؛ جو لوگ وہاں موجود تھے، انھوں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی اس وقت ملاقات مناسب نہیں ہے، مگر وہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھے، یہ گفتگو برآمدے میں ہو رہی تھی اور ذاکر صاحب ملے ہوئے کمرے میں تھے، جب انھوں نے دیکھا کہ آنے والے صاحب اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں، تو اسی بخار کی حالت میں باہر آ گئے اور فرمایا کہ چلیے کہاں چلنا ہے میں تیار ہوں۔ ذاکر صاحب کی یہ کیفیت اس وقت ہوتی تھی جب وہ انتہائی غصّے میں ہوں، کبھی تو ان کی یہ کیفیت سمجھ میں آ جاتی تھی اور کبھی بالکل سمجھ میں نہیں آتی تھی اور مخاطب اس غلط فہمی میں ہوتا تھا کہ وہ نارمل حالت میں پوری سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔

ذاکر صاحب کے غصّے پر ایک اور بات یاد آ گئی۔ غالباً ۶۵ء کی جنگ کا زمانہ تھا اور وار فنڈ کے لیے چندے وصول کیے جا رہے تھے، ایک جلسے میں ذاکر صاحب کو شرکت کے لیے دعوت دی گئی جس میں بڑے چندوں کے اعلانات کیے جانے والے تھے۔ نہ جانے کیسے اس جلسے میں میں بھی پہنچ گیا۔ جلسے کی کارروائی بہت تاخیر کے ساتھ شروع کی گئی۔ جلسہ ایک وسیع شامیانے کے اندر رکھا گیا تھا اور جو اسٹیج تیار کیا گیا تھا کچھ اس قسم کا تھا جیسا رام لیلا کے لیے گاؤں وغیرہ میں بنایا جاتا ہے، منتظمین بھی کچھ اچھے ذوق کے نہیں تھے، مجھے حیرت تھی کہ ذاکر صاحب جیسا خوش مذاق آدمی یہاں کیسے آ گیا۔ یہ صحیح تھا کہ وہ حکومتِ ہند کے ایک اہم عہدہ دار تھے، "وار فنڈ" کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم، مگر ذاکر صاحب کی شخصیت بھی تو کوئی چیز ہے؟ میں اسی قسم کی باتیں سوچ رہا تھا کہ جلسے کی کارروائی ختم ہوئی اور منتظمین جلسہ نے ذاکر صاحب سے کچھ فرمانے کی درخواست کی۔ ذاکر صاحب بادلِ ناخواستہ اٹھے اور اسٹیج کی طرف روانہ ہوئے۔ ہر پروگرام کے بعد اسٹیج کا پردہ کھینچ دیا جاتا تھا۔ یہاں لطیفہ یہ پیش آیا کہ جب ذاکر صاحب زینہ چڑھ کر اسٹیج کے دروازے پر پہنچے تو وہ صاحب جو آگے آگے تھے، انھوں نے

پردہ ہٹانے کی کوشش کی، نہ جانے کیا غلط فہمی ہوئی کہ اسٹیج والوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس پر تھوڑی سی کشمکش ہوئی جس کو دیکھ کر جلسے والے ہنس پڑے۔ خیر جب پردہ ہٹا اور ذاکر صاحب اسٹیج پر پہنچے اور تقریر شروع کی تو ان کا چہرہ دیکھنے اور تقریر سننے کے قابل تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ میں اس شرط پر آیا تھا کہ مجھے کچھ کہنا نہیں ہوگا، مگر اب جب مجھ سے کچھ کہنے پر اصرار کیا گیا ہے تو جو کچھ میں کہوں گا اسے سننا پڑے گا۔ اس کے بعد جلسے کی تاخیر اور نہایت بھونڈے انداز میں چندوں کے اعلانات پر بڑی کھری کھری سنائی۔ ان کی ایسی تقریر میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔

ذاکر صاحب میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ الم غلم ہر چیز پڑھتے تھے، اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود نہ جانے کہاں سے اس کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ پروفیسر محبیب صاحب، جو ذاکر صاحب کے گہرے اور مخلص دوستوں میں سے ہیں اور جامعہ سے جانے کے بعد وہی ذاکر صاحب کے جانشین مقرر ہوئے، ان کے بالکل برعکس تھے اور ہیں۔ وہ سوائے کسی ایک انگریزی روزنامے کے کوئی اخبار یا رسالہ نہیں پڑھا کرتے تھے، خاص طور پر اردو کے اخبارات و رسائل تو بالکل نہیں پڑھا کرتے تھے، اس سے فائدہ اٹھا کر میں پوری آزادی کے ساتھ جو چاہتا تھا لکھا کرتا تھا۔ اگر کوئی میری شکایت کرتا تو مجھ سے پوچھتے تھے اور مشورہ دیتے تھے کہ اختلافی اور نزاعی امور پر نہ لکھوں۔ مگر یہ ناممکن تھا کہ جامعہ کا کوئی شخص کوئی چیز لکھے اور ذاکر صاحب کو فوراً اس کی اطلاع نہ ہو جائے۔ ذاکر صاحب نے جب جامعہ کی باگ ڈور سنبھالی تو ایک شرط یہ رکھی تھی کہ اب کوئی شخص عملی سیاست میں حصّہ نہیں لے گا؛ اگر کسی کو حصّہ لینا ہو تو جامعہ سے استعفا دے کر حصّہ لے سکتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے ایسا کیا بھی۔ مگر بالکل ابتدا میں جب کچھ لوگ جامعہ کو تعلیمی ادارے سے زیادہ تحریک خلافت کا ایک ذیلی ادارہ سمجھتے تھے۔ مگر بعد میں یہ خیال لوگوں کے ذہن سے نکل گیا اور سبھی لوگ تعلیمی خدمت میں لگ گئے اور عملی سیاست کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ ۴۲ء کی تحریک میں کچھ لوگوں نے گاندھی جی سے شکایت کی کہ اتنے اہم موقع پر جامعہ ملیہ کے لوگ جنگ آزادی سے بالکل بے تعلق ہیں۔ گاندھی جی نے جامعہ کی پالیسی کی تائید کی اور فرمایا کہ وہ لوگ جو کام کر رہے ہیں وہ بھی جنگ آزادی کا ایک اہم حصّہ ہے، اگر وہ سیاست میں شریک ہو جائیں گے تو تعلیم کا یہ ضروری اور مفید کام تباہ ہو جائے گا۔ ۱۹۳۶ء کے عام انتخابات میں ریاست بہار کے موجودہ گورنر جناب قدوائی صاحب کی خواہش پر میں نے ان کے ایک چچا کے الکشن میں کچھ کام کیا تھا، میں نے اخفا کی پوری کوشش کی تھی، رخصت کی درخواست میں لکھا تھا کہ ایک ضروری کام سے وطن جا رہا ہوں۔ مگر ذاکر صاحب کو اطلاع مل گئی اور جب میں واپس آیا تو بڑی محبت سے سمجھایا اور الکشن جیسی سرگرمیوں کے ضرر رساں پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ جب وہ

ریاست بہار کے گورنر کی حیثیت سے پٹنہ آ گئے، تو میں سمجھتا تھا کہ اب فضول چیزیں پڑھنا چھوڑ دی ہوں گی، مگر مجھے تعجب ہوا جب اسی زمانے میں کسی موقع پر جامعہ گئے اور ایک عصرانے میں ان سے ملاقات ہوئی تو فوراً ہی سوال کیا کر گئے، آج کل کون سے مسائل زیر غور ہیں؟ اس زمانے میں میں نے ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" میں "عام فہم زبان" "اردو میں انگریزی الفاظ کا استعمال" اسی قسم کے بعض مسائل پر بحث چھیڑ رکھی تھی۔ ذاکر صاحب کا اشارہ ان ہی بحثوں کی طرف تھا۔ یہاں کا حال تو مجھے معلوم نہیں، مگر نائب صدر جمہوریہ اور صدر جمہوریہ کے زمانے کا مجھے اچھی طرح علم ہے کہ ان کے پاس جو اخبار، رسالہ اور کتاب جاتی تھی، جب تک ان پر ایک نظر نہ ڈال لیں، ان کے کمرۂ مطالعہ سے وہ ہٹائی نہیں جاتی تھیں، بہت سے لوگ اپنی تصانیف اور تخلیقات پر ان کی رائے بھی معلوم کرتے تھے اور عام طور پر وہ لوگوں کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے، جس کی وجہ سے بعض لوگ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے اور بعض لوگ ان کی ایسی رایوں سے انعامات یا ترقی یا کسی اور قسم کی منفعت کے مواقع پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔

ذاکر صاحب عام طور پر لوگوں کے خطوط کے جوابات ضرور دیتے تھے اور نائب صدر جمہوریہ ہونے تک وہ خود اپنے ہاتھ سے جواب لکھتے تھے، اس کے بعد چونکہ خطوط کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اس لیے سکریٹری کو خطوط لکھا دیتے یا ہدایت دیدیتے مگر دستخط خود کرتے تھے، ان کے سکریٹری کو یہ اختیار نہیں تھا کہ مولانا اجمل خاں صاحب کی طرح یہ لکھ دیتے کہ مولانا نے آپ کا خط دیکھ لیا ہے، انھوں نے یہ فرمایا ہے، وہ فرمائے۔ میری معلومات کے مطابق اس کے خلاف صرف ایک مثال ہے جو بجائے خود بڑی دلچسپ مثال ہے اور اس سے ذاکر صاحب کی مخصوص مزاجی کیفیت کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک صاحب نے ذاکر صاحب کو لکھا کہ میرے پاس آپ کے اتنے خطوط ہیں آپ اجازت دیں تو انھیں شائع کرا دوں۔ ذاکر صاحب نے اپنی عادت کے خلاف اس خط کا جواب لکھا نہیں لکھوایا، اور اس پر خود دستخط نہیں کیے، سکریٹری کے دستخط سے بھیجا گیا۔ ذاکر صاحب نے جہاں یہ لکھا کہ ان خطوط کے جو وہ بھیج چکے اب مالک وہ نہیں ہیں، مکتوب الیہ خود ہیں، وہ جو چاہیں کریں، وہاں یہ وضاحت بھی کر دی کہ یہ خط وہ خود اس لیے نہیں لکھ رہے ہیں کہ ان کے پاس یعنی مکتوب الیہ کے پاس جس قدر خطوط ہیں ان میں ایک اور کا اضافہ نہ ہو جائے۔

ذاکر صاحب کی زندگی اور عمل میں بعض لوگوں کو تضاد نظر آتا ہے، مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ایسا نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی صرف اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ کبھی وہ ایک بات پر زور دیتے ہیں، کبھی دوسری بات پر، اور یہ غلط فہمی بھی صرف ان کو ہوتی ہے جو ذاکر صاحب کے مزاج، ان کی طبیعت اور ان کے جملہ خیالات سے پوری

طرح واقف نہیں ہوتے اور وہ بظاہر دو متضاد باتوں میں مطابقت یا تطابق پیدا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر علی گڑھ کا ایک واقعہ پیش کرتا ہوں: وہ جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ تشریف لے گئے، تو کچھ دنوں کے بعد ہوسٹلوں کا معائنہ کیا اور طالب علموں سے باتیں کیں۔ وہ ایک کمرے میں گئے، تو اس کی دیواریں تصاویر سے بالکل خالی تھیں، انھوں نے فرمایا کہ بھئی، کچھ تو ان دیواروں پر لگایئے، کچھ نہیں تو کسی ایکٹر یا ایکٹریس کی تصویر ہی لگا لیجئے یا ایسا کلنڈر ٹنگا لیجئے جس میں تصاویر ہوں۔ کسی اور کمرے میں گئے تو وہاں سستے قسم کا کوئی کلنڈر تھا جس پر بازاری یا بھونڈی تصویر بنی ہوئی یا کسی ایکٹر یا ایکٹریس کی تصویر لگی ہوئی تھی تو وہاں فرمایا: یہ کیا بدمذاقی ہے، اگر آپ کو ایسا ہی شوق ہے تو کوئی ایسی اچھی سی تصویر لگایئے جو کسی آرٹ کا نمونہ ہو، یا کسی مشہور ادیب یا لیڈر کی یا کسی سائنس داں کا فوٹو لگایئے۔ ان کے ان مشوروں کو بہت سے لوگوں نے متضاد قرار دیا، لیکن اگر غور فرمایئے تو ایسا نہیں ہے۔

مجیب صاحب کے زمانے میں جامعہ میں ایک بحث یہ چھڑی تھی کہ ذاکر صاحب بہت زیادہ جمہوریت پسند تھے اور مجیب صاحب ایسے نہیں ہیں۔ خود مجیب صاحب کا خیال اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ ذاکر صاحب کے زمانے میں مجلس تعلیمی (اکیڈمک کاؤنسل) اور مجلس منتظمہ (اگزیکیوٹیو کمیٹی گورننگ باڈی) کے جلسے بمشکل سال میں ایک دو ہوتے تھے اور میرے زمانے میں ہر ماہ پابندی سے ہوا کرتے ہیں اور اس میں جو فیصلے ہوتے ہیں ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ مجیب صاحب کا یہ ارشاد بالکل صحیح تھا مگر جو لوگ یہ بات کہتے تھے اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ ذاکر صاحب کا طریق کار یہ تھا کہ وہ جامعہ کی اہم شخصیات سے تمام اہم معاملات میں مشورہ کرتے تھے اور اس کے لیے اکثر ان کے گھروں پر چلے جاتے تھے، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ کرتے وہی تھے جو مناسب سمجھتے تھے۔ لیکن وہ اشخاص جن سے وہ مشورہ کرتے تھے، یہ تو بھول جاتے تھے کہ ذاکر صاحب نے کیا کیا، ان کی خوشی اور اطمینان کے لیے اس قدر کافی تھا کہ انھوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میرا مشورہ لیا اور اس کے لیے میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ اولاً تو مجیب صاحب کے زمانے میں جامعہ کے حالات بھی بڑی حد تک بدل گئے تھے اور مسائل میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا اس کے علاوہ ان کے مزاج اور طبیعت کے خلاف تھا کہ انتظامی او راختلافی لوگوں کے گھروں کا چکر لگائیں یا انفرادی طور پر مشورہ کریں اور اگر ایسا وہ کرنے تو اتنی کتابیں اور مضامین نہ لکھ پاتے جو انھوں نے لکھی ہیں۔ جامعہ تو بہر حال اسی طرح چلتی جس طرح ان کے زمانے میں چلی، مگر علمی و ادبی دنیا ان کتابوں اور مضامین سے محروم رہ جاتی جو

مجیب صاحب کی دین ہیں۔

ذاکر صاحب کے علی گڑھ چلے جانے کے بعد، بہت دنوں تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ انہوں نے جامعہ کو کیوں چھوڑا اور علی گڑھ کیوں گئے؟ بعض لوگ ان پر الزام لگاتے تھے کہ انھوں نے جامعہ کے ساتھ بیوفائی کی ہے اور بعض طنز کرتے تھے کہ ارے صاحب، وہ تو شروع ہی سے علی گڑھ جانے کے لیے بے چین تھے، اب تک اس کا موقع نہیں ملا تھا، جب دیکھا کہ میدان صاف ہے تو چلے گئے، مولانا آزاد کا تو محض بہانہ ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ذاکر صاحب نے جو کچھ کیا اپنے ذاتی مفاد کے لیے نہیں کیا، بلکہ قوم، ملک اور تعلیم کے وسیع تر مفاد کی خاطر کیا اور اپنے ساتھیوں کی مرضی اور مشورے پر علی گڑھ گئے۔ یہ بات میرے نزدیک صحیح ہے کہ جامعہ کے حالات سے کسی حد تک بیزار اور اس کے بڑھتے ہوئے مسائل سے کسی قدر دل برداشتہ ہو گئے تھے، اور ایسا کیوں نہ ہوتا، انسان تھے "پیالہ و ساغر" نہیں تھے۔ تقریباً چوتھائی صدی تک جامعہ کی سربراہی کی تھی اور انتہائی نازک حالات میں اس کی رہنمائی کی تھی اور ایسے لوگوں کے نخرے برداشت کیے تھے جن کی بازار میں کوئی قیمت نہیں تھی۔ یہ صحیح ہے کہ جامعہ میں کام کرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی تھی، ان میں سے بہت سے لوگ علی گڑھ چھوڑ کر آئے تھے، ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے تنخواہیں سب کی کم تھیں، مالی پریشانیاں سب کو تھیں، مگر شکایت وہی زیادہ کرتے تھے جو بہت معمولی اور چھوٹے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابتدائی اسکول کے ایک استاد نے عید کے موقع پر ذاکر صاحب کو بہت سخت خط لکھا اور اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا۔ یہ پریشانیاں کس کو نہیں تھیں، مجھے جامعہ کے کاغذات میں مجیب صاحب کا ایک پرچہ ملا۔ جس میں انھوں نے جامعہ کے خازن کو لکھا تھا کہ مجھے فوری طور پر دس روپے کی سخت ضرورت ہے۔ مجیب صاحب گھر کے بہت امیر تھے، ان کے والد جب تک زندہ رہے ان کی مالی امداد کیا کرتے تھے، ان کی زندگی کا ایک معیار تھا، جس کو ہر حالت میں برقرار رکھا، مگر کبھی ایسا موقع بھی آ جاتا تھا کہ دس روپے کے لیے انھیں پرچہ لکھنا پڑتا، مگر ذاکر صاحب کی شرافت اور ذمہ داری کا احساس دیکھیے کہ ابتدائی اسکول کے استاد صاحب کی شکایت کا بظاہر ذرا بھی برا نہ مانا اور ان کے گھر جا کر ان کی خدمت میں کچھ رقم پیش کی۔ ایسے واقعات اکثر و بیشتر پیش آتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ کام کی یکسانیت بھی انسان کے قویٰ کو شل کر دیتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ ان کے معتمد علیہ ساتھیوں نے اس کی ذمہ داری لی تھی کہ وہ جامعہ کو اسی طرح چلاتے رہیں گے اور مستقبل نے یہ ثابت کر دیا کہ ذاکر صاحب کے جانے کی وجہ سے جامعہ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ پھر مجیب صاحب کو ذاکر صاحب کے مشورے برابر حاصل ہوتے رہے، خصوصاً جب تک وہ علی گڑھ میں رہے، بعد میں

وہ امیر جامعہ مقرر ہو گئے تھے، اس طرح جامعہ سے ان کا تعلق پھر قائم ہو گیا تھا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کچھ لوگوں نے مجیب صاحب اور ذاکر صاحب کے درمیان غلط فہمی پیدا کر دی اور دونوں دوستوں کے درمیان تعلقات کسی حد تک کشیدہ ہو گئے۔ غالباً میرے یہ الفاظ، صحیح صورت حال کے اظہار کے لیے صحیح نہیں ہیں؛ مجھے کہنا یہ چاہیے کہ کچھ لوگوں نے کوشش کر کے ذاکر صاحب کو مجیب صاحب کی طرف سے بدظن کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب باہر کے کچھ لوگوں نے جامعہ کے اندرونی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کی اور مجیب صاحب پر کچھ الزامات لگائے۔ ان لوگوں میں ریاست بہار کے ایک ایم۔پی بھی تھے، جو سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ ان الزامات کی وجہ سے مجیب صاحب نے استعفا دیدیا تھا، مگر تحقیقاتی کمیٹی نے ان کو تمام الزامات سے بری کر دیا اور انھوں نے اپنا استعفا واپس لے لیا۔ اس وقت مجھے یاد نہیں کہ ذاکر صاحب کو جو شکایت پیدا ہوئی تھی، وہ ان الزامات سے پہلے کی تھی یا بعد کی۔ بہرحال جامعہ میں جب یہ خبر پھیلی کہ ذاکر صاحب کو مجیب صاحب سے شکایت ہے اور خوش نہیں ہیں تو میں نے اسے بالکل بے بنیاد سمجھا، کیونکہ میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان دو مخلص دوستوں کو ایک دوسرے سے کوئی شکایت بھی ہو سکتی ہے۔ مگر جب ذاکر صاحب کا مجیب صاحب کے نام خط آیا تو اس افواہ کی تصدیق کرنی پڑی۔ ذاکر صاحب نے جو کچھ لکھا تھا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جامعہ کے اہم معاملات میں مجیب صاحب ان سے کوئی مشورہ نہیں کرتے اور جامعہ سے ان کو بالکل بے تعلق کر دیا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح تھی، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجیب صاحب ذاکر صاحب سے مشورہ کرنا اپنے لیے کسرِشان سمجھتے تھے یا ڈرتے تھے کہ ان کے اقتدار میں کوئی کمی آجائے گی، یا یہ کہ ذاکر صاحب جامعہ کے معاملات میں مداخلت کریں گے۔ ان میں سے کوئی بات نہیں تھی، بلکہ اس کی صرف دو وجہیں تھیں اور یہی وجہیں مجیب صاحب نے ذاکر صاحب کو لکھی تھیں۔ ایک یہ کہ مجیب صاحب جامعہ کے حالات لکھ کر اور نزاعی مسائل میں ان سے مشورہ مانگ کر، خواہ مخواہ کے لیے ان کو پریشان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ظاہر ہے اتنے فاصلے سے ذاکر صاحب مجیب صاحب کی پریشانیوں میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے اور جو مسائل وہاں پیدا ہوتے تھے ان میں کوئی مشورہ دینا بھی ان کے لیے مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ دوسری وجہ کا تعلق خود ذاکر صاحب کے ایک اصول سے تھا جسے ہم عدم مداخلت کا نام دے سکتے ہیں۔ ذاکر صاحب کا یہ بنیادی اصول تھا کہ جب وہ کسی کو کوئی کام سپرد کر دیتے تھے تو پھر اس میں کوئی مداخلت نہیں کرتے تھے، بلکہ اس پر مکمل اعتماد اور بھروسا کرتے تھے۔ یہی اصول مجیب صاحب کا بھی تھا؛ ممکن ہے انھوں نے یہ بات ذاکر صاحب ہی سے سیکھی ہو، مگر انھوں نے بھی اس پر مکمل طور پر عمل کیا۔ اسی وجہ سے یہ سمجھنے میں وہ بالکل حق بجانب تھے کہ ذاکر

صاحب نے جب جامعہ کی ذمہ داری مجھے سپرد کر دی ہے تو وہ یہ پسند نہیں کریں گے کہ اس کے معاملات میں کسی قسم کا دخل دیں، اس لیے اس خارزار میں انھیں گھسیٹنا مناسب نہیں ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ ذاکر صاحب اور مجیب صاحب کی دوستی اخلاص اور اصول پر تھی، مگر دونوں کے مزاج اور طبیعت میں کسی نہ کسی حد تک فرق تھا۔ اس لیے کبھی کبھی غلط فہمی کی صورتیں پیدا ہو جاتی تھیں یا دونوں کے خوشگوار تعلقات میں عارضی طور پر کوئی رکاوٹ پیدا ہو جاتی تھی۔ مثلاً مجیب صاحب سرکاری عہدہ داروں سے بہت زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے یا کم از کم ملاقات کے لیے خود اپنی طرف سے اقدام کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ جب ذاکر صاحب صدر جمہوریہ مقرر ہوئے اور وہ راشٹرپتی بھون میں منتقل ہو گئے تو ایک عرصے تک مجیب صاحب ان سے ملنے کے لیے نہیں گئے۔ وہ ذاکر صاحب کو رفیق کار اور دوست سے کہیں زیادہ اونچا مرتبہ دیتے تھے، ان کے انتہائی عقیدت مند تھے اور ان کی حیثیت مجیب صاحب کے دل میں ایک مرشد کی سی تھی۔ مگر راشٹرپتی ہونے کے بعد، وہ کہتے تھے کہ اب وہ حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار ہیں، جب وہ بلائیں گے، تبھی جاؤں گا۔ ادھر ذاکر صاحب نہ جانے کیا سوچتے تھے، بہرحال کچھ عرصے کے بعد ذاکر صاحب نے خط لکھا کہ یہ گوگو کی حالت کب تک رہے گی، نہ آپ آتے ہیں، نہ بلاتے ہیں۔ اس خط کا آنا تھا کہ برف پگھل گئی اور مجیب صاحب کا ملال ختم ہو گیا۔ مگر ابھی ایک واقعہ ہونا باقی تھا!

کوئی بیرونی مہمان دلّی تشریف لائے تھے اور راشٹرپتی بھون میں ان کے ایٹ ہوم کا پروگرام ایسی عجلت میں طے پایا کہ دعوت نامہ چھپوا کر بھیجنا ممکن نہیں تھا، اس لیے مدعوئین کو فون پر اطلاع کی گئی۔ مجیب صاحب کو کرنل بشیر زیدی صاحب نے راشٹرپتی بھون ہی سے اطلاع کی اور یہ بھی وضاحت کر دی کہ ریسپشن آفس کو اس کی اطلاع ہو گی اور انھیں کوئی زحمت نہیں ہو گی۔ مجیب صاحب وہاں پہنچے تو غلطی سے فہرست میں ان کا نام نہیں تھا، وہ فوراً واپس آ گئے۔ ذاکر صاحب کو فوراً ہی اس حادثے کی اطلاع ملی اور انھوں نے فوراً ان کی تلاش میں گاڑی دوڑائی، مگر مجیب صاحب ہاتھ نہیں لگے۔ اس کے بعد راشٹرپتی بھون کے تمام ذمہ دار افسروں کو حکم دیدیا گیا کہ مجیب صاحب جب بھی اور جس وقت بھی آئیں انھیں روکا نہ جائے۔ اس کے علاوہ ذاکر صاحب نے مجیب صاحب سے فرمایا کہ جب بھی آنا چاہیں ملنے کے وقت بلا تکلف آجایا کریں، یہ وقت میرا اپنا ہوتا ہے، اطمینان سے بات ہو سکتی ہے۔

مجھے اس وقت جو باتیں یاد آ رہی ہیں، ان میں صرف ایک ہی قابل ذکر بات رہ گئی ہے، وہ یہ کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر ذاکر صاحب کو قبل از وقت علی گڑھ چھوڑنا پڑا۔

ذاکر صاحب جب علی گڑھ گئے تھے تو یونیورسٹی کے انتظام کو بہتر بنانے اور اس کے علمی و تعلیمی معیار کو بڑھانے کے لیے ان کے ذہن میں بہت سی اسکیمیں تھیں۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ یونیورسٹی پر فرقہ پرستی کا جو الزام ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ صحیح ہے یا نہیں، مگر ایسی فضا پیدا کی جائے کہ کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملے۔ تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے وہ چاہتے تھے کہ چوٹی کے پروفیسر رکھے جائیں جو اپنے میدان کے فرد وحید ہوں۔ اسی سلسلے میں دو غیر مسلم پروفیسر رکھے گئے، ایک معاشیات کے اور ایک فزکس کے۔ اس کو سب نے تسلیم کیا ہے کہ یہ دونوں پروفیسر اپنے اپنے مضمون کے مانے ہوئے تھے، مگر بعد میں ان میں فزکس کے پروفیسر، شدید اختلافات کا باعث ہو گئے۔ ان اختلافات نے ایسی ناگوار شکل اختیار کر لی کہ ذاکر صاحب بالکل مایوس ہو گئے اور مجبور ہو کر استعفا دے دیا۔ ان کے استعفا کے بعد پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے ایک طویل اور بہت ہی جذباتی خط ذاکر صاحب کو لکھا تھا، جسے میں نے ذاکر صاحب کے کاغذات میں دیکھا ہے۔ انھوں نے بڑی ہی لجاجت اور اصرار کے ساتھ درخواست کی تھی کہ ذاکر صاحب اپنا استعفا واپس لے لیں اور یونیورسٹی کو چھوڑ کر نہ جائیں، انھوں نے تمام اساتذہ کی طرف سے ان کو یقین دلایا تھا کہ وہ ان کے ساتھ مکمل تعاون کریں گے اور آئندہ ان کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ مگر دل ایک ایسا نازک شیشہ ہے جو ایک مرتبہ ٹوٹ جائے تو دوبارہ اس کا جڑنا ناممکن ہے۔ اسی طرح ذاکر صاحب راجیہ سبھا کی صدارت سے مایوس اور بیزار ہوئے تو نائب صدر جمہوریہ کی مدت کے ختم ہونے کے بعد دوبارہ اس کے لیے کسی حالت میں تیار نہیں تھے۔ ذاکر صاحب گاندھی جی کے معتمد علیہ ساتھیوں میں سے تھے۔ علمی و تعلیمی میدانوں میں ان کا مرتبہ بڑا اونچا تھا، بین الاقوامی حیثیت کے مالک تھے۔ مگر سیاسی اختلافات کی سطح افسوسناک حد تک پست تھی، خود اس پارٹی کے اندر بھی جس کی راجیہ سبھا میں بھاری اکثریت تھی۔ ذاکر صاحب شاید سب کچھ برداشت کر سکتے تھے، مگر پست ذہنیت اور خود غرض لوگوں کو برداشت کرنا ان کے لیے قطعاً ناممکن تھا۔ ان نامساعد حالات میں ذاکر صاحب نے جو کچھ کیا، وہ ان کی عظمت، بلندی اور خلوص کا نتیجہ تھا، ورنہ ہمارا سماج ایسا نہیں کہ ذاکر صاحب جیسا حساس اور نازک مزاج اتنے سارے کام کر سکتا جو انھوں نے انجام دیے ہیں، صرف تعلیم کے میدان ہی میں نہیں، جو ان کا اپنا میدان تھا، سیاست کے میدان میں بھی جس سے وہ دور بھاگتے تھے!

(۴ نومبر ۱۹۸۰ء کو خدا بخش لائبریری میں سنایا گیا)

●●

بیگم انیس قدوائی

● بیگم انیس قدوائی (پ ۱۹۰۶ء) اُردو کی ممتاز ادیبہ، جو انرگ ولایت علی "بمبوق" کی صاحبزادی اور رفیع احمد قدوائی کی بھانجی بہن اور بھاوج ۔ رفیع احمد قدوائی کے بھائی شفیع احمد قدوائی سے شادی ہوئی جو ۱۹۴۷ء میں مسوری کے فرقہ وارانہ فساد میں شہید ہوئے۔ شوہر کے انتقال کے بعد فرقہ وارانہ فساد سے متأثر لوگوں کی خدمت میں مشغول ہوگئیں اور ۱۹۵۶ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر راجیہ سبھا کی ممبر نامزد ہوئیں۔ راجیہ سبھا کے لئے پھر دوبارہ نامزد کیا گیا۔ انور جمال قدوائی (شیخ الجامعہ) ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔

"آزادی کی چھاؤں میں"؛ "اب جن کے دیکھنے کو" اور "نظرے خوش گزرے"

ان کی اہم تصانیف ہیں۔ ذاکر صاحب پر یہ مضمون ان کی آخری تحریری یادگار ہے۔

۱۶ جولائی ۸۲ء کو ۷۵ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

○

مرحومہ کے دو یادگار خطوط جو اس مضمون سے متعلق ہیں، اقتباساً نقل کیے جاتے ہیں:

"سلام علیک! اپنے پیر کے درد کی وجہ سے کسی طرح طبیعت ہی حاضر نہ ہوئی۔ برسوں سے بہتر ہوئی تو لکھنا شروع کیا۔ مسودہ صاف کرنے کا بھی وقت نہ تھا۔ یونہی بھیج رہی ہوں۔ ذاکر صاحب پر تو بہتر سے بہتر مقالے پڑھے جائیں گے۔ میری یادداشت بھی اب پہلے جیسی نہیں رہی بڑا پھیکا اور سطحی مضمون ہے۔ پھر بھی نذرِ عقیدت تو ضرور ہی ہے۔ شریک نہ ہو سکی اس کا افسوس ہے۔"

"اخلاق میاں نے بھی مجھے بلایا تھا۔ لیکن اپنے پیر کے درد اور آنکھ کی کمزوری کی وجہ سے اب میں سفر سے بہت گھبراتی ہوں۔ ویسے بھی بقول حافظ شیرازی:

چون پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون شو

پر اپنی عمر کی وجہ سے عمل کرنے لگی ہوں۔ اگر جمال آرہے ہوتے تو شاید میں بھی ارادہ کر لیتی۔ اکیلے ہمت نہ پڑی۔ اخلاق کو دعائیں اور معذرت کہہ دیجیے۔ اللہ بلانے والوں کو سلامت رکھے۔ آپ سب کا شکریہ۔"

خیر طلب
انیس قدوائی

●●

"خدا شرے برانگیزد کہ خیرے مادراں باشد"، جب میری بد قسمتی مجھے دہلی لائی تو اتنی خوش قسمتی بھی ساتھ ساتھ چلی آئی کہ ان سب قد آور شخصیتوں کو جن کے دور کے جلوے نے ساری عمر مرعوب رکھا تھا اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھ لوں اور ان کے ساتھ چھوٹا موٹا کام بھی کر لوں۔ اس لئے:

نازم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ان اہم ترین ہستیوں میں ایک ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی تھے جو اس زمانہ میں شیخ الجامعہ تھے۔ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم کی چندہ جمع کرنے والی سفارت اور بارہ بنکی کے بہت سے لوگوں کے جامعہ ملیہ میں کام کرنے کی وجہ سے شمالی ہند کے قصبات میں عام طور پر جامعہ ملیہ اور شیخ الجامعہ متعارف تھے۔

مجھے تو خیر رفیع بھائی کی دی ہوئی ایک دعوت میں خود اپنے گاؤں "مسولی" میں انھیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اس لئے صورت آشنا بھی تھی۔ ان دنوں سخت پردہ کی وجہ سے محفل میں شریک ہونا کیا، کھلے عام بالا خانے سے دیکھنا ناممکن تھا۔ خدا بھلا کرے بزرگوں کا ــــــ انھوں نے کوٹھے پر کچھ جھلی والی کھڑکیاں لگوا دی تھیں۔ جانتے ہوں گے کہ یہ عورتیں بغیر تاک جھانک کے تو رہ نہیں سکتیں۔ کبھی جھلی کی جھری سے باہر کا نظارہ کر لیں تو کچھ حرج نہیں، اور واقعی مردانے میں کوئی مجمع ہو تو بغیر دیکھے ہمیں چین نہیں آتا تھا۔ یوں میں نے ذاکر صاحب کو بھی دیکھ لیا تھا۔

کئی سال بعد دہلی میں پہلی بار گاندھی جی کے یہاں ان کو دیکھا تو پہچان گئی۔ گاندھی جی کہہ رہے تھے: "ذاکر صاحب قرول باغ جا کر دیکھ لو، کچھ سامان تمہارے جامعہ کا لوگوں نے بچا لیا ہے۔" مجھے نہیں معلوم کہ وہ پھر گئے یا نہیں گئے۔ البتہ گاندھی جی کے کہنے پر جب پناہ گزینوں کے کیمپ گئی، تو وہاں ایک دن بھرے ہوئے مجمع میں گھرے ہوئے حیران پریشان کھڑے تھے۔ پرانے قلعہ میں وہ ایکبار اور مقبرۂ ہمایوں میں اکثر ملنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن دوری و اجنبیت برقرار رہی۔

مقبرہ میں ذاکر صاحب کی بھیجی ہوئی طالب علم اور ٹیچروں کی ایک پوری ٹیم کام کر رہی تھی۔ صبح جامعہ کی ایک وین نوجوان کی پوری کیمپ پہنچا جاتی، دوپہر میں کچھ بالٹیوں میں دال اور گٹھر میں بندھی روٹیاں لے کر آتی اور شام کو ان سب تھکے ہاروں کو واپس لے جاتی تھی۔

ہم اناڑی سوشل ورکر اس وقت گھبرا اٹھے جب کیچڑ اور سردی بڑھی۔ بارش نے بے سروسامانوں کو ٹھٹھرا دیا اور یہ فکر ہوئی کہ ان کے لئے گدّے کمبل کہاں سے لاویں گے۔ ایک روز دیکھا کہ اسی وین میں جوٹ کے گدّے پیال بھر بھرے چلے آ رہے ہیں۔ اس انتظام نے دل خوش کر دیا۔ انھیں دنوں چند لاوارث بچوں کی رہائش و تربیت کا سوال پیدا ہوا اور مجھے جامعہ ملیہ جانا پڑا۔

ادکھلے کے اوبڑ کھابڑ میں درختوں اور پھول پتیوں سے گھرا ہوا جامعہ ملیہ اسکول بہت اچھا لگا۔ ذاکر صاحب کے گھر گئی۔ ان کی وضع قطع دیکھ کر جس سادہ زندگی کا تصور کیا تھا بالکل ویسے ہی دیکھا۔ فرش پر ایک نمدہ بچھائے کاغذات میں گھرے بیٹھے تھے۔ تخت پر مخملیں قالین بچھائے گاؤ تکیہ سے لگی بیگم تشریف فرما تھیں اور پاس میں ان کا تومند بلا جو خوب کوفتے کھا کھا کر موٹا ہوا تھا گھر کا نگہبان بنا ہوا آرام کر رہا تھا۔ گھر میں فرنیچر نام کی بس چند چیزیں تھیں۔ بیگم نے ذاکر صاحب کی مصروفیت سے بے نیاز ہو کر مسکراتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا اور اس مخلصانہ انداز سے کچھ میری ہمت اور بڑھ گئی۔ اپنی آمد کا مدعا بیان کیا۔ پڑھائی لکھائی تو ان دنوں تقریباً بند تھی۔ اس لئے ذاکر صاحب نے ایک ماسٹر اور چپراسی کا انتظام کر کے مجھے دوسرے ہی دن بچوں کو لانے کے لئے کہہ دیا۔

ظاہر ہے اپنی امانت رکھانے کے بعد اکثر جانے آنے کا سلسلہ رہا اور ہر بار اس خانقاہ کے مکینوں سے متاثر ہو کر لوٹی۔

ذاکر صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ مغل اعظم کی طرح انھوں نے بھی اپنے گرد کچھ نورتن اکٹھے کئے تھے۔ وہ جرمن خاتون جو آپا جان کہلاتی تھیں اور اسکول کے بورڈنگ کی نگراں تھیں چند ہی دن پہلے انتقال کر چکی تھیں۔ مگر بچوں کے ٹیچر اور مصنف محمود علوی صاحب موجود تھے۔ بچوں کے شاعر شفیع الدین نیر، آرٹ اینڈ کرافٹ کے دیوانے کلام صاحب، جامعہ کے ارکنگ ہاتھ۔ فاؤسٹ کے مترجم عابد صاحب اور بہت سے لوگ جنھوں نے اپنی زندگیاں جامعہ کو دے رکھی تھیں، پوری مستعدی سے جامعہ ملیہ کو حیات و موت کی کشمکش سے نکالنے پر لگے ہوئے تھے۔

اور خود ذاکر صاحب جامعہ کے احاطہ میں گشت کرتے ہوئے کوڑا کرکٹ کلاس میں پھٹے ہوئے کاغذ سب اپنی جیب میں ٹھونستے جاتے تھے۔ جب جیب بہت بھر جاتی تو کوڑے کو بالٹی میں لوٹ دیتے۔ جسے دیکھ کر طلبا اور ٹیچر بھی شرمندہ ہو جایا کرتے تھے۔

ایک خاص بات ان میں یہ تھی کہ وہ پٹھان سے زیادہ انسان نظر آتے تھے۔ مجھے معاف کیجئے، لمبا پٹھانوں کے بارے میں اودھ کے شیخ زادوں کا نظریہ ——— تنا ہوا گھونسا، اٹھا ہوا ڈنڈا اور کڑی کمان سے بنا ہوا تھا۔ کیونکہ ملیح آباد کے پٹھانوں نے کچھ ایسا ہی تاثر ان کے اندر پیدا کر دیا تھا۔ لیکن ذاکر صاحب کو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ وہ تو ایسے دھیمے، میٹھے پُر سکون تھے کہ مجھے بھی سنے سنائے نظریہ کو بدلنا پڑا۔ بلکہ جو دیکھا تھا اس پر سے بھی یقین اُٹھ گیا۔ نہ اُن کی چڑھی ہوئی مونچھیں تھیں نہ بیچ سے مانگ نکلی ہوئی ڈاڑھی۔ چہرہ پر خشونت کا کیا ذکر، یہاں تو رحم و مروت کی بارش ہو رہی تھی۔ ایک موقع پر برسبیل تذکرہ جب انھوں نے بیگم کو کھری پٹھانی کہا، تب خیال آیا کہ ارے یہ بھی تو اسی قبیلہ سے اور جنگجو خاندان کے فرد ہیں۔

ایک بار فریدآباد کے سرحدی پناہ گزینوں کے لئے خیموں میں انہوں نے آٹھ اسکول شروع کرائے۔ لیکن شورش پسندوں نے ذرا سی بات لے کر ان کے دروازہ پر مظاہرہ کرا دیا۔ میں نے سوچا کہ آج تو ان کی پٹھانی رگ ضرور بھڑک اٹھے گی۔ لیکن حیرت ہو گئی جب انھوں نے دروازہ بند کر لیا اور پوری خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے۔ نہ سرزنش کی اور نہ برا بھلا کہا۔ شانتی ہونے پر سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کر دیا۔

ہندوستان کی صدارت دو معلّموں کے حصہ میں آئی اور دونوں نے اپنی علمی قابلیت سے دنیا کو متاثر کیا۔ لیکن پتا نہیں یہ کیسے نئی نسل کے معمار سیاسی جھمیلوں میں پھنس گئے۔ ذاکر صاحب علی گڑھ کے وائس چانسلر بنے تو خیر ٹھیک تھا۔ ایک ایجوکیشنسٹ کی پارلیمنٹ کی ممبری بھی غیر مناسب نہ تھی۔ لیکن گورنر، وائس پریسیڈنٹ اور پھر صدر جمہوریہ بننا ہم سب کے لئے تو فخر کا باعث ہوا مگر خود ان کو پٹری بدلنا پڑا اس نے ان کو اور اُبھرتا ہوا تعلیمی معیار ایک رہبر کھو کر تنزل کی طرف مائل ہو گیا۔

سب سے پہلے جامعہ ملیہ کے ذریعہ ان کے دور میں بچوں کا لٹریچر، بچوں کا تعلیمی میلہ، بچوں کے پارک کا نمونہ ملک کے سامنے آیا۔ بالغ آدمیوں کا پورا کورس عوام تک پہنچا۔ بچوں کے بینک اور بچوں کی پارلیمنٹ کا نظریہ جامعہ ملیہ ہی نے پیش کیا۔ بلکہ ایک دن کی حکومت نے ان کے اندر احساس ذمہ داری کی داغ بیل ڈال دی۔

وہ سالے یارانِ نجد کے گرویدے تھے اس لئے ان سے مل کر بہت کچھ میں نے سیکھا۔ سوشل ورک میں تنظیم، خوش سلیقگی اور خلوص کے سبق لینے کے ساتھ ساتھ بزرگوں کی قدامت۔ خطاطی کے نمونے، ہر ٹیڑھی میڑھی چیز کے اندر تلاشِ حسن کی تعلیم بھی ان سے ملی اور ۱۹۵۰ء کے بعد اپنی آئندہ زندگی میں ان سب سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو بہت مدد ملی۔

مذہبی وسیع القلبی اور جذبۂ خلوص کی بدولت وہ ہر کام کرنے والے کے لئے نشانِ راہ بن جایا کرتے تھے۔

اتنی مرنجان مرنج طبیعت کی وجہ سے کسی بات پر اڑ جانا اور بہ جبر دوسروں سے منوا لینا ان کے لئے ناممکن ہو جایا کرتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ اُردو کے لئے بیس لاکھ دستخط انہیں کے ذریعہ پیش کرانے کے بعد جب خود ان کے ایام صدارت میں دادرسی نہ ہوئی اور ساری محنت ردّی کی ٹوکری کی نذر ہو گئی تو حامیانِ اُردو کو اس سے خاصی شکایت پیدا ہو گئی لیکن ان کے خلوصِ نیت پر شک نہیں ہوا۔ یہ کہا کہ کر صبر کر لینا پڑا:
ع رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند۔

سادگی کی انتہا تھی کہ جانتے بوجھتے ہوئے امرتسر اسٹیشن پر اپنے پیروں قتل گاہ کی سمت چل پڑے، نہ دشمنوں سے ہاتھا پائی کی نہ گالی گلوج۔ بقول فیضی:

جس دھج سے چلا مقتل میں کوئی وہ شان سلامت رہتی ہے ٭ یہ جان تو آتی جاتی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

اس مخلص دوست کا خدا بھلا کرے جس نے دوڑ دھوپ کر کے ان حضرات کو بچا کر ہم سب پر اور مملکت پر احسان کیا۔
پھر جب شنکر اچاریہ سے ذاکر صاحب کی ملاقات پر ثقہ حضرات نے ناک بھوں چڑھائیں اور سرا سر الزام اس دوست پر رکھا جو پھول پھل ناریل سمیت انہیں اچاریہ کے قدموں میں لے گیا تو سب متعجب رہ گئے کہ یہ سب کیسے ہوا۔ جس شخص نے کسی مشائخ و پیرزادہ کی قدمبوسی نہ کی ہو، کبھی کسی مزار پر ماتھا نہ ٹیکا ہو، وہ ایک سادھو کے چرنوں میں بیٹھنے کیسے چلا گیا۔
لیکن ان کے پرانے مزاج شناس جانتے تھے کہ اپنی ہوشیاری و پُرکاری کے باوجود کسی کی دل آزاری ان سے دشوار تھی، اس لئے ان کی سادگی یہ سوچ کر مطمئن ہو جائے گی: چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند
ذاکر صاحب کی یاد کے ساتھ رہروانِ راہ کو علم و عمل اور خدمتِ خلق کا وہ معیار یاد آ جاتا ہے جو نصف صدی تک ہندوستان پر چھایا رہا اور اب حماقت بنتا جا رہا ہے۔
پھر بھی مجھے فخر ہے۔ میں نے انہیں دیکھا۔ ان کے ساتھ کام کیا۔ کچھ عرصہ کارزارِ حیات میں ایک وسیع النظر استاد سے عمل اور پُر خلوص ٹریننگ حاصل کی اور اس دورِ تماشا نشینی میں حرف ہدیۂ عقیدت ہی پیش کر سکتی ہوں ——— خدا انھیں اپنی رحمت سے نواز دے۔

●●

مشاہیر کی محسن کتابیں

- حبیب الرحمٰن خاں شروانی
- سیّد سلیمان ندوی
- عبد الماجد دریا بادی
- عبید اللہ سندھی
- مناظر احسن گیلانی
- میاں الٰہ بشیر احمد
- بدر الدین علوی
- سیّد طلحہ
- سعید احمد اکبر آبادی
- سیّد نواب علی
- اعزاز علی (دیوبند)
- شاہ حلیم عطا
- عبد العزیز میمن
- عبد السلام ندوی
- خواجہ غلام السیّدین
- ابو الحسن علی ندوی

۴۰ سال کے قریب ہوئے ماہنامہ الندوہ (لکھنؤ) کی عہد جدید کی چند اشاعتوں میں ایک سلسلہ مضامین "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" کے عنوان سے مسلسل چھپا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں محمد عمران خان ندوی نے اس پورے سلسلہ کو سید ابوالحسن ندوی صاحب کے ایک مضمون کے اضافہ کے ساتھ اس نام سے کتابی شکل میں شائع کرایا۔ آئندہ صفحات میں ان سارے مضامین میں ہر مضمون نگار نے جن کتابوں کا تذکرہ کیا ہے وہ سب یکے بعد دیگرے نقل کیا جا رہا ہے۔

امید ہے مشاہیر کا یہ انتخاب دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ آئندہ ممکن ہوا تو اس کا دائرہ وسیع تر کیا جا سکے گا۔

مشاہیر کی محسن کتابیں

(۱) **حبیب الرحمٰن خاں شیروانی :** اُردوئے معلّٰی، عودِ ہندی (غالب)، آبِ حیات، دربارِ اکبری (آزاد)، المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، شعر العجم (شبلی)، مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم (شبلی)۔

کنز العمال، مقالات الاسلامیین (اشعری)، بستان المحدثین (شاہ عبدالعزیز)، ازالۃ الخفا (شاہ ولی اللہ)، تذکرۃ الحفاظ (ذہبی)، طبقات (ابن سعد)، معارف (ابن قتیبہ)، مقدمہ شرح بخاری (ابن حجر عسقلانی) وفیات (ابن خلکان)۔

حالاتِ مرزا مظہر (شاہ غلام علی)، حالات شاہ غلام علی (شاہ عبدالغنی)، فوائد الفواد (حسن دہلوی)، سلسلۃ العارفین۔

(۲) **سید سلیمان ندوی :** شبلی کی تصانیف، تقویت الایمان (شاہ اسماعیل شہید)، عجالۂ نافعہ (شاہ عبدالعزیز)، بستان المحدثین (شاہ عبدالعزیز)، تذکرۃ الحفاظ (ذہبی)، مقدمہ فتح الباری (ابن حجر) وفیات (ابن خلکان)۔

الفہرست (ابن ندیم)، کشف الظنون (حاجی خلیفہ)، دلائل الاعجاز (جرجانی)، حماسہ، نقد الشعر، ملل و نحل (شہرستانی)، الملل و النحل (ابن حزم)، کشف الادلہ (ابن رشد)، حجۃ اللہ البالغہ (شاہ ولی اللہ)، ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کتابیں۔

(۳) **عبدالماجد دریابادی :** مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈریں، گلستاں، بوستاں، رقعات قتیل، یوسف زلیخا، کیمیائے سعادت۔

ترکِ اسلام (ثناء اللہ امرتسری)، سرمۂ چشم آریہ (مرزا غلام احمد قادیانی)، نور الدین (حکیم نور الدین)، ماہ نامہ تحفۂ محمدیہ (محمد علی مونگیری)، الاسلام و تاریخ الاسلام (احسان اللہ عباسی)، شرر و منشی سجاد حسین کی تصانیف، الکلام و مقالاتِ شبلی، رسالہ الندوہ، مسز بیسنٹ اور ڈاکٹر بھگوان داس کی کتابیں، بھاگوت گیتا کا ترجمہ، سیرۃ النبیؐ جلد اوّل۔

اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی اور مولانا محمد علی کا خاموش اثر۔

مثنوی معنوی مع مولانا امداد اللہ مہاجر مکی کے حاشیوں کے، مولانا محمد علی لاہوری کا ترجمۂ قرآن، محمد علی کی نظمیں، اقبال کی نظمیں، مکتوبات مجددی، عطار، جامی، شیخ جیلانی، غزالی، سہروردی کی تصانیف؛ لیکن سب سے گہرا نقش مثنوی کا تھا اور مکتوبات کا۔ Islam on the Cross Roads by Md. Asad۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی تصانیف، صحیح بخاری اور فتح الباری، مفردات القرآن، تاج العروس، لسان العرب۔

(۴) عبید اللہ سندھی: تحفۃ الہند (عبید اللہ)، تقویت الایمان (اسمٰعیل شہیدؒ)، قبلہ نما (قاسم نانوتوی)، حجۃ اللہ البالغہ، الفوز الکبیر، فتح الرحمٰن، البدور البازغہ (شاہ ولی اللہ)، عبقات (مولانا شہید)، تکمیل الاذہان (رفیع الدین) سطعات۔ (شاہ ولی اللہ دہلوی)

تفہیمات الٰہیہ، ازالۃ الخفا (شاہ ولی اللہ)، احکام القرآن (ابوبکر رازی)، علم الہیئت (ایاس برنی)۔

(۵) مناظر احسن گیلانی:۔ تفسیر کبیر، الہلال (مولانا آزاد)، احیاء العلوم (غزالی)، تصانیف شاہ ولی اللہ، تصانیف ابن عربی، عبقات (اسمٰعیل شہید)، مکتوبات شرف الدین یحییٰ منیری، میزان الکبریٰ (وہاب شعرانی)، تذکرہ اعظم (مفتی عبداللطیف)، اقبال کا کلام، محمد علی کا کلام، مولانا تھانوی کی تصانیف، مولانا جامی کی غزلیں، رحمۃ للعالمین (قاضی سلیمان منصور پوری)

(۶) میاں بشیر احمد: الفاروق، محمد (کارلائل)، دیوان حافظ، لے مزرابل Les Misérables (ہوگو) (دنیا کے بڑے مفکرین)

(۷) بدر الدین علوی: اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈریں، شمس التواریخ چار حصے، شاہ عبد القادر کا ترجمۂ قرآن مع تفسیر ابن عباس، سفر نامہ بلاد اسلامیہ از عبد الرحمٰن امرتسری، اصول عجیبہ، رسالہ اللذہ، لٹریری ہسٹری (نکلسن)، عربین پوئٹری (لائل)، مفضلیات: مقدمہ (لائل)، عربین پوئٹری (کلارسٹن)، عربک لٹریچر (ہوورٹ)

تفسیر خازن، حاشیہ جمل، فتح الباری، عمدۃ القاری، اللمعات، مرقات المفاتیح، تہذیب التہذیب، فتح القدیر، عینی، عنایۃ، قاموس، امالی (قالی)، الکامل، اخبار الاخیار، اصول المقصود۔

(۸) سیّد طٰہٰ (اورینٹل کالج لاہور): کتاب العمدہ (ابن رشیق)، الکتاب (سیبویہ)، مقامات زیری، جاحظ، اغانی، الامامہ والسیاسہ (ابن قتیبہ)، نہج البلاغہ، حماسہ، قصائد متنبیؔ، المنظہر (سیوطی)، الکامل (مبرد)، فتح الباری، موطا، بخاری، مسند ابن حنبل، زاد المعاد، الاکلیل فی استنباط التنزیل (سیوطی)، تفسیر احمدی، تفسیر ابن عربی، احکام القرآن (جصاص)، مفتاح العلوم (سکاکی)، الطراز، دلائل الاعجاز، احیاء العلوم، مثنوی روم، رسالہ قشیریہ، عوارف المعارف، فتوح الغیب، مکتوبات مجدد، التفرقہ بین الاسلام والزندقہ (غزالی) حجۃ اللہ، صدرئی، شرح مواقف، شمس بازغہ، تحریر ابن الہمام، توضیح وتلویح، ابن تیمیہ کی تصانیف، شفاء العلیل (ابن قیم)، ابن خلدون۔

آبِ حیات، گلشن بیخار، گل رعنا، مقدمہ حالی، شعر العجم

(۹) سعید احمد اکبر آبادی: کامل (مبرد)، اغانی، نہایت الارب، صبح الاعشیٰ، البیان والتبیین (جاحظ) حماسہ، مقاصد الفلاسفہ وتہافۃ الفلاسفہ (غزالی)، ابن سینا کی اشارات امام رازی وطوسی کی شرحوں کی مدد سے؛ سقط الزند، لزوم مالایلزم (معری)، دیوان حسّان بن ثابت۔

شبلی وسید سلیمان ندوی کی تصانیف خاص کر المامون، الغزالی، الفاروق، سیرۃ النبیؐ جلد اول (شبلی)، ارض القرآن، سیرۃ عائشہؓ، امام مالک، رسالہ معارف (سید سلیمان)، رسالہ "زمانہ" "جامعہ" اور رسالہ "اردو"۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کتابیں۔

انقلاب فرانس (برک)، مقالات میکالے، اسپرٹ آف اسلام (امیر علی) دیوان حافظ، دیوان غالب۔

(۱۰) سیّد نواب علی: شاہ عبدالقادر کا ترجمۂ قرآن، کیمیائے سعادت، احیاء العلوم، المنقذ من الضلال، تذکرۃ الاولیاء (عطار)، مثنوی روم، فتوح الغیب، تفسیر سرسید، خطبات احمدیہ، اسپرٹ آف اسلام (امیر علی) ________ اور

امیر علی کی History of the Saracen

اور آرنلڈ کی Preaching of Islam

الکلام، الغزالی، رسائل شبلی، تفسیر کبیر، تفسیر خازن، ابن کثیر، بیضاوی، تفسیر ابن جریر، طبقات (ابن سعد)، اصابہ، میزان الاعتدال، تفسیر جامی، مجمع البیان، صحیحین، کافی۔

(۱۱) اعزاز علی دیوبند: -- گلستان، سکندر نامہ، بیضادی، نور الانوار،

مقامات حریری، مفصل (زمخشری)، اوضح المسالک، شرح الفیہ (ابن عقیل) سیبویہ، تاریخ یمینی، کلام امراء القیس، سقط الزند (معری) دلائل الاعجاز، مطول، مختار الصحاح، منتہی الادب، لسان العرب مجلہ عدلیہ، الحج الواضحہ فی البینات الراجحہ، شرح وقایہ، شرح نقایہ (ملا علی قاری) ریاض الصالحین (نووی) تصانیف غزالی۔

(۱۲) شاہ حلیم عطا صاحب : تفسیر فتح العزیز، بخاری، الدین الخالص (صدیق حسن خاں) فتح الباری، مزہر (سیوطی) فقہ اللغہ (ثعالبی)، اذکار (نووی) التبیان فی آداب حملۃ القرآن، ریاض الصالحین (نووی) تلبیس ابلیس اور صفۃ الصفوہ (ابن جوزی)، الواسطہ بین الخلق والحق (ابن تیمیہ)، زاد المعاد (ابن قیم)، الاسماء والصفات (بیہقی)، قیام اللیل (محمد بن نصر مروزی) المجید موطا، شرح مسلم (نووی)، شفاء العلیل، (ابن قیم)، الغایۃ الامانی ——— (آلوسی زادہ) الملل والنحل اور ابن حزم کی دوسری تصانیف۔

ابن جوزی، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن رجب، ابن الہادی، ابن حجر عسقلانی، محمد ابن ابراہیم وزیر یمانی، محمد بن اسماعیل امیر یمانی، محمد بن علی شوکانی، صدیق حسن خاں کی تصانیف۔

منہاج السنہ، الجواب الصحیح عن بدل دین المسیح، ابن تیمیہ کی اہم ترین کتاب المجموعۃ الرسائل اور ابن قیم کی زاد المعاد، تفاسیر میں ابن کثیر اور کتب تواریخ میں البدایہ والنہایہ۔

(۱۳) عبد العزیز میمن (پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ) : مفصل، کتاب سیبویہ، معلقات عشرہ دیوان متنبی، حماسہ، جمہرۃ اشعار العرب، مفضلیات، مقامات، سقط الزند، دیوان ابو العتاہیہ، خزانۃ الادب، حماسہ (ابو تمام) حماسہ (البحتری)، وحشیات (ابو تمام)، حماسۃ الخالدین، حماسۃ بصریہ، حماسۃ مغربیہ۔

قراضۃ الذہب (ابن رشیق)، رسالۃ الانکار (ابن شرف)، شرح المختار من اشعار بشار العمدہ (ابن رشیق)، الموشح فی ماخذ العلماء علی الشعراء (مرزبانی)، لآلی، کامل (مبرد) ادب الکاتب، کتاب البیان والتبیین، امالی (ابو علی القالی)

(۱۴) عبد السلام ندوی : آمد نامہ، صفوۃ المصادر، کریما، مامقیمان، اللہ قدالی، بوستاں، گلستاں، اخلاق محسنی۔

شبنم شاداب، دیوان غنی، دیوان ہلالی، انوار سہیلی، سکندر نامہ، بہار دانش، مینا بازار۔
میزان، منشعب، زبدہ، پنج گنج، صرف میر، نحو میر، ہدایت النحو، قال اقول، صغریٰ، کبریٰ، میزان منطق، شرح تہذیب، شرح مطالع، ملا جلال، حجۃ اللہ، امور عامہ، حواشی مولانا عبدالحی فرنگی محلی، کافیہ، شرح جامی، قدوری، قطبی، میر قطبی، شرح وقایہ، میبذی، نور الانوار، ہدیہ سعیدیہ، ملا حسن، میر زاہد۔

گلدستۂ پیام یار، گلدستۂ پیام عاشق، گلدستۂ دامن گلچیں۔

الفاروق (شبلی)، مقدمہ شعر و شاعری، حیات سعدی، یادگار غالب (حالی)، حکیم محمد علی کے ناول، محمد حسین آزاد کے مضامین، عبدالماجد دریا بادی کی فلسفۂ اجتماع، فلسفۂ جذبات، تاریخ اخلاق یورپ۔

تفسیر کبیر (رازی)، شرح حکمت العین، شرح حکمت الاشراق، توضیح تلویح، ہدایہ، حماسہ، سبعہ معلقہ، متنبی، نقد الشعر، دلائل الاعجاز، قاضی مبارک، صدری، صحیح بخاری۔

(۱۵) **خواجہ غلام السیدین:** ترجمان القرآن (ابوالکلام آزاد)، مواعظ حسنہ (عبدالعلی حربی) اقبال کا کلام، مسدس حالی، مراثی انیس، پریم چند کے ناول اور افسانے، حالی کی حیات جاوید، سرشار کا فسانۂ آزاد، فرحت اللہ بیگ کے مضامین، ٹیگور کی بعض ادبی اور قومی تصانیف، عبدالرحمٰن بجنوری کا مقدمۂ دیوان غالب۔

مغربی مصنفوں میں ڈکنس، گوئٹے، رسل، برنارڈ شا، ایچ۔جی۔ ویلز، اناطول فرانس، رومارولاں، اپٹن سنکلر۔

(۱۶) **ابوالحسن علی ندوی:** منظوم فتوح الشام (عبدالرزاق کانپوری)، مسدس حالی، رحمۃ للعالمین (قاضی سلمان منصورپوری)، الفاروق (شبلی)، آب حیات (محمد حسین آزاد)، گل رعنا (عبدالحی)، نیرنگ خیال (محمد حسین آزاد)، حالی، نذیر احمد، شرر اور رتن ناتھ سرشار کی چند کتابیں، یاد ایام (عبدالحی)، معرکۂ مذہب و سائنس (ڈریپر، مترجمہ: ظفر علی خاں)۔ مولانا حیدر حسن، الشیخ تقی الدین ہلالی المراکشی، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی، اقبال، مولانا الیاس کاندھلوی، مولانا احمد علی کی تحریریں، رسالۃ الغفریری (ابوالحسن علی الغفریہ)، النظرات (منفلوطی)، شرح امام نووی، ابوداؤد کی الادعیہ، ترمذی کی الزہد والرقاق، غزالی کی احیاء العلوم، الامامۃ والسیاسۃ (ابن قتیبہ)، کلیلہ دمنہ (ابن مقفع)

کتاب الاغانی (ابو الفرج اصفہانی)، جاحظ کے رسائل امیر شکیب ارسلان کی تحریریں، عبد الرحمٰن الکواکبی کی ام القریٰ، محی الدین قصوری کا سلسلہ مضامین سید احمد شہید کے بارے میں، رسالہ "توحید" امرتسر مرتبہ مولانا داؤد غزنوی ۲۷ - ۲۹)، زاد المعاد (ابن قیم)۔

محمد بن نصر مروزی کی قیام اللیل، ابن تیمیہ کی تفسیر سورۂ نور، ابن قیم کی الجواب الکافی، صاحب ہدایہ کے ایک شاگرد کی کتاب "تعلیم المتعلم"۔ والد مرحوم کی ارمغان احباب، مولانا محمد علی مونگیری کی ارشاد رحمانی فوائد الفواد (حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء)، دار المعارف (شاہ غلام علی) تلبیس ابلیس۔

عبد الماجد دریا بادی کا "سچ"۔ ابو الاعلیٰ مودودی کا "ترجمان القرآن" "تنقیحات" اسلام ایٹ دی کراس روڈ (Islam at the Crossroads) از محمد اسد۔

احمد امین کی فجر الاسلام جلد اوّل، ضحی الاسلام تین جلدیں، مولانا ابو الکلام کا تذکرہ، الہلال اور ترجمان القرآن کی دوسری جلد، سید سلیمان ندوی کی خطبات مدارس۔ سرسید کے تہذیب الاخلاق کے فائل، حیات جاوید (حالی)، دقار حیات (اکرام اللہ خان ندوی)، سید طفیل احمد کی حکومت خود اختیاری اور مسلمانوں کا روشن مستقبل۔

نزہت الخواطر (عبد الحی)، اقبال کا کلام، مذہب و عقلیات (عبد الباری ندوی)، ابن تیمیہ کی سورۂ اخلاص اور کتاب النبوات کے اشارات، شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات، شاہ ولی اللہ کی ازالۃ الخفا، حجۃ اللہ البالغہ اور الفوز الکبیر، شاہ اسمٰعیل شہید کی منصب امامت۔

سید احمد شہید کے ملفوظات کا مجموعہ، صراط المستقیم (مرتبہ شاہ اسمٰعیل شہید)

حکیم محمد عمران خان
عمرانی دواخانہ، امیر گنج ٹونک۔

خدابخش لائبریری کے چند اہم اور نادر مخطوطات

(۱)

فاکہۃ البُستان :-

اس کے مصنف مولانا محمد ہاشم بن عبدالغفور التتوی ہیں جو علما سندھ میں ٹھٹھہ کے مشہور عالم گذرے ہیں۔ مزید تصانیف کے مالک ہیں۔ اس کتاب میں فقہ کے اہم ذخیرے کو سامنے رکھتے ہوئے جانوروں کی حلت وحرمت سے بحث کی گئی ہے۔ اور اس سلسلہ میں جو کچھ انھیں حاصل ہو سکا ہے وہ تمام معلومات اس میں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس طرح کتاب کا ایک حصہ ذبح کے مسائل پر مشتمل ہے اور نہایت جامع حصہ ہے۔ جانوروں کے سلسلے میں جہاں سے حصہ شروع ہوتا ہے وہاں ایک ایک جانور کو علیحدہ علیحدہ بیان کر کے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

اس کتاب کا ایک نادر نسخہ ہمارے ذاتی کتب خانہ (کتبخانہ عرفانیہ ٹونک) میں بھی موجود ہے اور بہت اچھا نسخہ ہے۔ اُسے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کا ارادہ بھی ہے۔ لیکن خدابخش لائبریری کا نسخہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ یہ نسخہ مصنف کی زندگی کا لکھا ہوا ہے اور یہاں کے اندراج کے مطابق مصنف کا خود قلمی ہے۔ ۱۱۲۸ھ میں اس کی تصنیف شروع ہوئی اور ۲ رجب ۱۱۳۲ھ کو اسکی تکمیل ہوئی۔ کتابت کے بعد ہی یہ نسخہ کسی ادا ںب کی ملکیت میں آگیا جو مصنف سے تعلق میں بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ جن صاحب کی ملکیت میں یہ نسخہ آیا، ان کی مُہر ثبت ہے۔ لیکن افسوس وہ مُہر محو کر دی گئی ہے البتہ اُس پر جو نوٹ دیا ہوا ہے وہ اس طرح ہے: "قد تشرف بتملیکه صاحب الخاتم"

اس کے بعد مزید نوٹ اس طرح ہے :

" الجزء الاوّل من فاکهة البستان تصنیف ذی الفضل والفضائل العالم العامل العارف الکامل المجود المقری المحدث الفقهی محمد الهاشم السندی التتوائی

مولداً والتتوی مسکنا، سلمہ المحیی الحی الذی لایموت ابداً۔"

کتاب کے شروع میں تفصیلی فہرست شامل ہے۔ کتاب اس طرح شروع ہوتی ہے: "سبحانک لاعلم لنا الاما علمتنا" الخ۔ پھر لکھتے ہیں:

"اما بعد فیقول الافقر الراجی الی رحمۃ رب البلاد، قلیل البضاعۃ والزاد محمد الهاشم بن عبد الغفور التتوی اقامۃ البتورائی من حیث الولاد، ان ھذہ نبذۃ" الخ

اختتام جو مصنف کے ترقیمے کی حیثیت بھی رکھتا ہے، وہ اس طرح ہے:

"تمت الرسالۃ المسماۃ بفاکھۃ البُستان بید مؤلفہ الفقیر الحقیر محمد ھاشم بن عبد الغفور رحمھما ربھما انہ غفور شکور وغفر اللہ لکاتبہ ومالکہ مع والدیھما ولجمیع المومنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات آمین یارب العالمین۔ قد تم ھذہ الرسالۃ الشریفۃ۔ یوم الاثنین من شھر رجب فی تاریخ ثالث منھا اثنان وثلاثون ومائۃ والف۔"

یہ نسخہ ۲۵۷ اوراق پر مشتمل ہے۔

جانوروں اور اُن کی خصوصیات کے سلسلہ میں علامہ الدمیری کی کتاب "حیوۃ الحیوان" بہت مشہور ہے اور متعدد بار طبع بھی ہو چکی ہے۔ اس کتاب سے بھی فاکہۃ البستان میں بہت استفادہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ ذکر غیر مفید نہیں ہوگا کہ حیوۃ الحیوان کا اُردو ترجمہ غالباً اب تک نہیں ہوا ہے یا نہیں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ ہمارے نسبی جد امجد مولوی فضل الحق صاحب ٹونکی خطیب جامع مسجد متوفی ۱۳۲۴ھ نے کیا ہے، جو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور مترجم کے قلم سے ان کا اصل مسودہ ہے۔ امتداد زمانہ کے مطابق زبان میں کافی فرق ہے لیکن اُسے باسانی جدید زبان میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

(۲)

مولانا عبد الحق صاحب خیرآبادی کی ایک تصنیف "التحفۃ الوزیریہ فی المسائل النحویہ" کا نسخہ دیکھنے میں آیا۔ مولانا کی تصانیف میں شاید اس کا ذکر ہو۔ لیکن یہاں اس لائبریری میں اس کا نسخہ دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا عبد الحق صاحب خیرآبادی المتوفی ۱۳۱۶ھ اپنے والد بزرگوار

مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی المتوفی ۱۲۷۸ھ کی طرح ٹونک کے رئیسوں سے بھی متعلق رہے ہیں۔ بلکہ غدر کی تباہی کے بعد دو سال ان کا قیام ٹونک میں رہا ہے۔ غالباً اسی زمانۂ قیام میں آپنے یہ کتاب تصنیف کی اور اسے نواب وزیرالدولہ جانشین نواب امیرالدولہ بہادر (۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء تا ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء) کے نام پر معنون کیا اور اسی مناسبت سے اس کا نام "التحفۃ الوزیریہ فی المسائل النحویہ" رکھا۔ کتاب کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

"یامالک یوم الدین إیاک نعبد وإیاک نستعین ونصلی علی رسولک" الخ

وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وبعد فیقول العبد الفقیر الی اللہ الغنی الہادی محمد عبدالحق خیرآبادی انجاہ اللہ عن ظلمات الجہل وہداہ الی نور العلم والفضل، انی مع قصور باعی فی البراعۃ وخیبۃ قدحی فی الضاعۃ وتراکم افواج الہموم علیّ، وتلاطم امواج الغموم لدیّ، حررت رسالۃ فی علم النحو وجعلتہا تحفۃ للجناب المقدس المشتہر فی العرب والعجم، صاحب السیف والقلم، الواصل الی اخص معارج الشوکۃ والحشمۃ، البالغ اقصی مدارج الجلالۃ والعظمۃ، اعنی النواب وزیر الدولۃ امیر الملک محمد وزیرخان بہادر نصرت جنگ لازالت اعلام علمہ رافعۃ ورأیات دولتہ ناصبۃ، وسمیتہا "بالتحفۃ الوزیریہ فی المسائل النحویہ" واللہ الموفق للصدق والصواب وبہ الاعتصام فی کل باب، وہا انا اشرع فی المرام لغایۃ الملک العلام ۔ الکلمۃ دال علی معنی مفرد بالوضع، وینقسم" الخ

کتاب کا اختتام اس طرح ہے:

"ھذا آخر بحث الحروف وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ بعدد کل لمح وطرف"

ابتدائی حصہ میں اور درمیان میں متعدد حواشی بھی پائے جاتے ہیں۔ ان حواشی سے اور اصل متن کی کتابت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اور اس کے منہیات خود مصنف کتاب کے قلم سے ہیں۔ کتاب پر اگرچہ ترقیمہ درج نہیں لیکن ٹونک ریکارڈ میں مولانا کی کئی تحریرات نواب صاحب کے نام دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، طرز کتابت اور خط کی ہم آہنگی بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔ حواشی کے ساتھ "منہ حفی عنہ" کی کشش اور طرز، خصوصیت سے

اس کا ثبوت ہیں۔ واللہ اعلم

(۳)

خدا بخش لائبریری کے ذخیرہ میں ایک کتاب "تذکرہ فی سفر آگرہ" مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ یہ کتاب بھی ٹونک سے متعلق ہے۔ نواب وزیرالدولہ کے بیٹے صاحبزادہ عبداللہ خاں صاحب نے ابتدائی عمر میں اسے ترتیب دیا ہے۔ جب کہ انہیں اپنے والد صاحب کے ساتھ آگرہ کا سفر کرنے کا موقع ملا۔ ۱۲۷۷ھ میں لارڈ کیننگ جب ڈھاکہ اور بنگالہ کی مہم سے واپس آرہے تھے اُس وقت آگرہ میں رؤسا کا ایک اجلاس ہوا۔ جس میں دوسرے رؤسا کے ساتھ نواب وزیرالدولہ والی ریاست ٹونک نے بھی بڑے تزک واحتشام کے ساتھ شرکت کی اور نواب صاحب کے فرمانے کے مطابق صاحبزادہ عبداللہ خاں صاحب نے یہ سفرنامہ بڑے اہتمام سے ترتیب دیا۔ زبان نہایت صاف، شستہ اور فارسی ادبیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ساتھ ساتھ اشعار اور نظموں کی چاشنی بھی ہے۔ سفر کی روداد کے ساتھ درمیان کی منزلوں کی بھی کافی تفصیلات ہیں۔ چنانچہ بیانہ، کروائی، فتح پور سیکری اور بالآخر آگرہ کی کافی تفصیلات اس سفرنامہ میں ملتی ہیں۔ پھر جن رئیسوں نے شرکت کی اُن میں خاص خاص ریاستوں کے کچھ تاریخی حالات ہیں۔ ۱۲۸۰ھ میں اس سفرنامہ کی تکمیل ہوئی۔ آخر میں کچھ تاریخی قطعات بھی ہیں جن میں ایک قطعۂ تاریخ، مولوی الٰہی بخش صاحب نازش خیرآبادی المتوفی ۱۲۸۶ھ کا بھی ہے۔ اس نسخہ کے کاتب حافظ عزیزالرحمٰن صاحب ٹونکی ہیں جو ٹونک کے مشہور خوش نویس گذرے ہیں اور استاد اصغر علی آبرو کے شاگردوں میں تھے۔ کتابت کا سال بھی یہی ہے۔ یہ نسخہ ۳۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ٹونک میں بھی اس سفرنامے کے کئی نسخے تھے لیکن افسوس آہستہ آہستہ سب ضائع ہو گئے۔ صاحبزادہ عبداللہ خاں صاحب کے پسر نائب الریاست صاحبزادہ عبیداللہ خاں صاحب کے کتب خانہ میں بھی اس کا نسخہ تھا، معلوم نہیں وہ کیا ہوا۔ اس سفرنامہ کا ایک نسخہ مرحوم حافظ محمود خان شیرانی کے ذخیرہ کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانہ میں داخل ہوگیا، جو وہاں محفوظ ہے۔ اور ذخیرۂ شیرانی کے مخطوطات کی جو فہرست وہاں سے شائع ہوئی ہے اُس میں اس نسخہ کی بھی کچھ تفصیلات ہیں۔ اسی طرح اُس میں صاحبزادہ عبداللہ خاں صاحب کی ایک دوسری تصنیف کا بھی نسخہ ہے اور اُس کی کچھ تفصیلات بھی اس فہرست سے معلوم ہوتی ہیں۔

ابتدا: الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام .... اما بعد میگوید اضعف عباداللہ الرحمٰن عبداللہ خان، مراجی رحمت ایزد منان .... و نام این رسالہ "تذکرہ فی سفر آگرہ" نہادم۔ شعر:

۱۔ "حکایات ناصرہ فی سفر آگرہ"

شد مرتب این رسالہ دلپسند ؛ در ہزار و دو صد و ہفتاد و ہفت الخ

اس رسالہ کا نمبر ۲۵۱۸ ہے اور ۳۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۴)

طبقات المفسرین : للعلامہ شمس الدین محمد بن علی بن احمد الداؤدی المالکی تلمیذ الحافظ عبد الرحمن جلال الدین السیوطی (سلسلہ ۲۳۹۰ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری) ۱۳۲ اوراق پر مشتمل ہے۔ حروف کی ترتیب پر مفسرین کے حالات لکھے ہیں۔ صاحب ایجاز البیان کے لئے لکھتے ہیں :

"محمود بن ابی الحسین النیشاپوری الغزنوی ملقب بیان الحق قال یاقوت کان عالماً بارعاً مفسراً لغویاً فقیہا متقنا فصیحا، لہ تصانیف ادعی فیہا الاعجاز، منہا خلق الانسان، جمل الغرائب فی تفسیر الحدیث، ایجاز البیان فی معنی القرآن وغیر ذلک۔ ومن شعرہ۔

فلا تحقرن خلقا من الناس علۃ ؛ ولی الہ العالمین وما تدری

فذو القدر عند اللہ خاف عن الوری ؛ کما خفیت من علمھم لیلۃ القدر" (ورق ۱۱۹، ۱۱۸)

کسی صاحب نے پنسل نمبر ڈال رکھے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ۱۴۴۱ مفسرین کے حالات ہیں۔ شاید کسی نے اسماء پر کام کیا ہو۔ کتاب کے آخری ورق پر "یوسف بن قزغلی" پر نام پر ایک حاشیہ رشاد بن عبد المطلب مصری کے قلم سے اس طرح درج ہے کہ :

"الصواب قزاوغلی ومعناہ بالترکیۃ ابن البنت أی السبط۔ وھذا معنی قولہ سبط ابن الجوزی"

رشاد بن عبد المطلب عرب لیگ کی جانب سے مصر سے ۱۹۵۲ء میں ایک وفد کی شکل میں ہندوستان آئے تھے اور اس وقت مولانا آزاد کی معرفت ہندوستان کے مختلف کتب خانوں سے نادر کتابوں کی فوٹو کاپیاں جس کا انتظام وہ خود کر کے آئے تھے، لی تھیں۔ ٹونک کے کتب خانہ سے بھی کافی کتابیں اسی طرح حاصل کی تھیں اور کئی روز ٹونک میں قیام رہا۔ اسی زمانہ میں مولانا ارشاد جب یہاں آئے ہوں گے اس وقت اس پر یہ نوٹ دیا ہوگا۔ اس نسخہ کے کاتب قاسم علی حیدرآبادی ہیں اور ۲۹ شعبان ۱۲۹۳ھ اس کی تاریخ کتابت ہے غالباً کسی نادر نسخہ سے نقل کرایا ہوا نسخہ ہے۔ جلد دل شیخ تی، لوح کتاب قدرے مطلّٰی و مینا کار ہے۔

(۵)

یہاں ایک تاریخ بھرت پور، فارسی کا نسخہ بھی دیکھنے میں آیا۔ یہ مختصر تاریخ ہے۔ اس میں راجہ درجن سال حاکم بھرت پور اور انگریزوں کے درمیان جو نزاع ہوا ہے اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس کے مرتب اندرا ئے

کمائستہ ہیں جو ۱۲۴۰ھ میں بھرت پور سے متعلق تھے۔ ادیب آدمی معلوم ہوتا ہے، فارسی بہت اچھی اور ادبیانہ ہے ۱۴۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ پیشِ نظر نسخہ کے کاتب کوئی قادر بخش ہیں اور ۱۲۴۴ھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔ مکمل نسخہ ہے۔

ابتدا: "دمیست قدیم و عادتی است مستدیم کہ حکمیت بالغہ قادر کارساز تعالیٰ الخ"

پھر لکھتے ہیں: "بندۂ خاکسار، ذرۂ بمقدار اندرای درسنہ یک ہزار دو صد چہل بیاوری بخت بیدار، سعادت الخ"

اختتام: "والحمد للہ والمنۃ کہ این تازہ حکایت بہ عین عنایت آن سرو گلستان امارت بہ ضبط کتابت درآمد و در عرصہ یک ہفتہ باتمام رسید۔ بیت:

از بزرگان دعا طمع دارم ؛ زانکہ من بندہ گنہ گارم"

بھرت پور کی تاریخیں عام طور پر ملتی نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے نسخہ نادر اور اچھا ہے۔

(۶)

یہاں "ادیب نامہ" مرتبہ منشی لرہادن لال شاداں کا قلمی نسخہ بھی دیکھنے میں آیا۔ ۱۲۵۰ھ کا مکتوبہ ہے اسی سال نواب امیر خان صاحب والیٔ ٹونک کا انتقال ہوا ہے اور اُن ہی کے حالات میں یہ کتاب ترتیب دی گئی تھی۔ اُن کا طریقہ تھا کہ اپنی زندگی میں اس کے متعدد نسخے تیار کراتے رہتے اور مختلف متعلق حضرات اور رؤسا کو بھیجتے رہتے تھے۔ یہ نسخہ بھی اسی طرح کا تیار شدہ معلوم ہوتا ہے۔ نسخہ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے مصور بھی کرانا چاہا ہے۔ جگہ جگہ مصوری کے لئے جگہ چھوڑی ہوئی ہے اور حاشیہ پر نوٹ ہے کہ یہاں کس کی تصویر بنائی جائے گی۔ یہ نسخہ ۱۸۴ اوراق پر مشتمل ہے۔ عطاء اللہ نومسلم ساکن دہلی اس کے کاتب ہیں۔

(۷)

تفسیر واحدی کے بھی یہاں کئی نسخے دیکھنے میں آئے۔ علامہ واحدی پانچویں صدی کے مفسر ہیں انہوں نے تین تفسیریں لکھی ہیں۔ ایک نہایت طویل ہے۔ اس کا نسخہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ دوسری تفسیر بسیط ہے۔ اس کے نسخے ٹونک اور رامپور وغیرہ میں محفوظ ہیں۔ تیسری تفسیر، تفسیر وجیز ہے (یہ شاید کبھی طبع بھی ہوئی ہے) اس کے دو نسخے اس لائبریری میں ہیں۔ ٹونک اور رام پور کے کتب خانوں میں بھی اس کے نسخے محفوظ ہیں۔ تفسیر بسیط اچھی ہے۔ یہاں اور ٹونک کا نسخہ قدرے محشیٰ بھی ہے۔ یہاں ایک نسخہ تفسیر واحدی کے نام سے ہے اور ایک جلد ہے۔ شاید یہ تفسیر وسیط واحدی کی ہو۔

••

غالب، یاس یگانہ اور حسرت عظیم آبادی

[غلام رسول حسرت عظیم آبادی (پ ۱۳۰۳ھ) شاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ ۱۳۵۶ھ (۱۹۳۷ء) میں دیوان مرتب ہوا۔ قلمی دیوان سے یہ دلچسپ ورق نقل کیا جا رہا ہے]

غالب: شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا — اس تکلف سے کہ گویا بتکدہ کا در کھلا

یاس: واں نقاب اٹھی کہ صبحِ حشر کا منظر کھلا — یا کسی کے حسنِ عالمتاب کا دفتر کھلا

حسرت: چاک پھر سینہ کیا داغوں کا پھر منظر کھلا — درد پھر دل میں ہوا اور غم کا پھر دفتر کھلا

غالب: منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں — زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

یاس: اشکِ خوں سے زرد چہرے پر ہے اک طرفہ بہار — دیکھئے رنگِ جنوں کیسا مرے منہ پر کھلا

حسرت: اور رنگِ حسن دونا ہو گیا وقتِ عتاب — یہ نقابِ سرخ کتنا آپ کے منہ پر کھلا

غالب: گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب — آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

حسرت: قتلِ عاشق اس قدر منظور ہے اس شوخ کو — تیغ رکھتا ہے کمر میں، ہاتھ میں نشتر کھلا

یاس: بند آنکھیں ہو گئیں بیتاب ہو ہو کر گرے — سامنے پیاسوں کے کس نے رکھ دیا ساغر کھلا

حسرت: چشمِ میگوں دیکھ کر ساقی کی دل بیخود ہوا — میں نے یہ سمجھا کہ ہے رکھا ہوا ساغر کھلا

غالب: گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کے بھید — پر یہ کیا ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

حسرت: راز کی باتیں کہیں کب لاکھ گو پوچھا کئے — نامہ بر ہرگز نہیں تیرا پری پیکر کھلا

یاس: چپ لگی مجھ کو گناہِ عشق ثابت ہو گیا — رنگ چہرے کا اڑا، رازِ دلِ مضطر کھلا

حسرت: دکھ سہا گو لاکھ لیکن رنگِ رخ بدلا نہیں — مرتے مرتے بھی نہیں رازِ دلِ مضطر کھلا

غالب: بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا — رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

حسرت: پھر امنڈ آئی ہماری چشمِ تر یادش بخیر — آج پھر یاد درِ گنجینۂ گوہر کھلا

غالب: کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول — آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

حسرت: کٹ گیا دن ہجر کا خوشیاں منا دُعمزدو | شب ہوئی وہ چاند نکلا دیدۂ اختر کھُلا
یاس: خنجر قاتل سے جنت کی ہوا آنے لگی | اور بہار زخم سے فردوس کا منظر کھُلا
حسرت: فصلِ گُل آئی ادھر، صحنِ چمن رنگیں ہوا | داغِ دل سے اس طرف فردوس کا منظر کھُلا
غالب: در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا | جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھُلا
حسرت: ضعف ہو تیرا بُرا، اس در پہ میں جانے کو تھا | وائے ناکامی مرا لپٹا ہوا بستر کھُلا
یاس: نیم جاں چھوڑا تری تلوار نے اچھا کیا | ایڑیاں بسمل نے رگڑیں صبر کا جوہر کھُلا
حسرت: اس حسیں کو یاد آتی ہیں وفائیں اب مری | خاک ہو جانے پہ میرے صبر کا جوہر کھُلا
یاس: صحبتِ واعظ میں بھی انگڑائیاں آنے لگیں | راز اپنی میکشی کا کیا کہیں کیونکر کھُلا
حسرت: داغ ہائے دل کو رکھا سات پردوں میں نہاں | راز الفت کا تمہاری خیر یہ کیونکر کھُلا
غالب: اسکی امت میں میں ہوں میرے رہیں کیوں کام بند | واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھُلا
یاس: ہاتھ اُلجھا اب گریباں میں تو گھبراؤ نہ یاسؔ | بیڑیاں کیونکر کٹیں زنداں کا در کیونکر کھُلا

حسرت: قدسیوں میں ہوگا پھر کیونکر نہیں اس کا شمار
جس پہ اے حسرتؔ کہ رازِ ساقیٔ کوثر کھُلا

(فسانۂ محبت معروف بہ دیوان حسرت)
صفحہ ۳۸۳-۸۴

●●

وسیم احمد اعظمی
ریسرچ اسسٹنٹ، ریسرچ یونٹ (یونانی)
(سی۔سی۔آر۔یو۔ایم)
خدا بخش لائبریری، پٹنہ

تصحیح و اضافہ

(۱)

زبدۃ الطب

مفتاح الکنوز، جلد ۳، نمبر ۳۱۸، پروگریس نمبر ۳۵۶۰

اصل کتاب کے آغاز سے قبل تین اضافی تحریریں ملتی ہیں۔ اول الذکر دونوں تحریریں زبدۃ الطب کے بارے میں مصنف، سن تالیف و سن کتابت سے متعلق معلومات پر مشتمل ہیں۔ آخر الذکر تحریر کتاب کی شیرازہ بندی سے متعلق ہے۔ اضافی تحریر ۱ کے راقم ابو القاسم ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"این کتاب 'زبدۃ الطب' از ابتدا تا شروع کتاب معالجات جزویہ، تصنیف سید اسماعیل جرجانی است کہ برای سلطان علاء الدین تکش خوارزم شاہ تصنیف نمودہ۔ و معالجات جزویہ تصنیف ابو الحسن مختار بن حسن مشہور بہ ابن بطلان است، نامش 'تقویم الصحۃ' است کہ سید مذکور با کتاب خود تضمین ساختہ۔ تصنیف 'تقویم الصحۃ' در سن ۴۴۰ چہار صد و چہل ہجری و تصنیف متن سید ہٰذا، در سن ۵۹۰ پانصد و نود ہجری است"

اضافی تحریر ۲، اضافی تحریر ۱ کے بعد کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ راقم الحروف کا نام مذکور نہیں ہے۔ اس کی عبارت اس طرح ہے:

"این کتاب ہفتاد سال بعد تقریباً بعد از تصنیف نوشتہ شدہ، مصنفش تا آخر معالجات کلیہ سید اسماعیل جرجانی مصنف کتاب ذخیرہ خوارزم شاہی است۔ و مصنف معالجات جزویات ابن بطلان نصرانی صاحب کتاب تقویم الابدان"

فہرست ساز خدا بخش لائبریری نے عربی مخطوطات کی مطبوعہ فہرست مفتاح الکنوز، جلد سوم صفحہ ۱۵۱ میں اس جلد میں شامل نوادر کا اجمالی تعارف کراتے ہوئے اس نسخہ کے بارے میں لکھا ہے:

"زبدۃ الطب در فن طب است، مؤلفہ سید اسماعیل الجرجانی این کتاب برای سلطان خوارزم در سال ۶۷۰ھ یعنی چہل سال بعد وفات مؤلف نقل شدہ بود"

اضافی تحریر ۱ کے مطابق 'زبدۃ الطب' کی تصنیف ۵۹۰ھ میں ہوئی اور یہ درست نہیں ہے، کیونکہ جرجانی کا انتقال ۵۳۱ھ میں ہو گیا تھا۔ اسی طرح اضافی تحریر ۲ کے مطابق یہ نسخہ جرجانی کے

کے انتقال کے ۷۰ سال بعد نقل کیا گیا۔ حالانکہ اسکی کتابت محمود السمنانی کے ہاتھوں ۶۷۰ھ میں ہوئی مزید اضافی تحریر ۲ سے پتہ چلتا ہے کہ معالجات جزدیہ ابن بطلان کی تالیف ہے جو "تقویم الابدان" کا بھی مصنف ہے۔ حالانکہ "تقویم الابدان فی تدبیر الانسان" کا مؤلف ابن جزلہ ہے۔

فہرست ساز ۔ کے خیال میں یہ نسخہ ۶۷۰ھ میں مؤلف کے انتقال کے ۴۰ سال بعد سلطان خوارزم شاہ کے لئے نقل کیا گیا۔ جرجانی کے سن وفات ۵۳۱ھ کے حساب سے گویا یہ نسخہ انتقال کے تقریباً ایک سو انتالیس سال بعد لکھا گیا ـــــ ہمیں نفس مخطوطہ میں کہیں بھی اس طرح کے اشارات نہیں ملتے جو اضافی تحریر ۱ و ۲ نیز فہرست ساز کی تحقیق کی تصدیق کر سکیں ـــــ ۔ مفتاح الکنوز ص۱۹۲ جلد سوم میں ابن بطلان کو "یاسین" لکھا گیا ہے جو درست نہیں ہے مزید معالجات جزدیہ کو اس سے منسوب کر دیا گیا ہے جب کہ مخطوطہ کے ابواب کی تقسیم اور اس کی عبارت کے مطابق یہ بھی جرجانی ہی کی تالیف ہے۔

اضافی تحریر ۱ معالجات جزدیہ کو ابن بطلان کی تالیف تقویم الصحۃ قرار دیتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تقویم الصحۃ ابن بطلان کی تالیف ہے۔ سید اسمٰعیل جرجانی نے تقویم الصحۃ کو زبدۃ الطب میں شامل کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن اس نسخہ میں تقویم الصحۃ کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ کیونکہ "تقویم الصحۃ" کا ایک قلمی نسخہ حیدرآباد دکن میں موجود ہے، جو بڑی تقطیع کے ۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ادویہ کے مزاج اور افعال و خواص کا ذکر ہے اور یہاں کے نسخہ میں ادویہ سے متعلق مباحث شامل نہیں ہیں!!

••

عابد رضا بیدار

(۲)

ایک مخطوطہ دو اندراج

۱۹-۱۸-۶۲۱۷ نمبر کی کتابیں کیپ کے ظفر نواب صاحب کے تحفہ کے طور پر لائبریری کو ایک ساتھ ملیں۔ فی الحال بحث ۱۷ اور ۱۹ کے بارے میں ہے۔ قاسم نظام ۱۹۶۳ء تک دونوں کرم خوردہ اور بوسیدہ حال میں پہنچی تھیں۔ پہلی (۶۲۱۷) کے بارے میں مزید یہ بھی بیان ہے کہ ناقابل مرمت ہے۔ ۶۲۱۷ پر جس کتاب 'حکایات الصالحین' کا اندراج تھا، وہ کسی مرحلے پر خارج کر دی گئی یا خود خارج ہو گئی اور اگلا اندراج کرنے والے نے اُسے physically دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس اگلے اندراج میں جو ۱۹۵۵ء میں ہوا، اوراق کی تعداد کا اندراج نہ پایا جانا اس خیال کی توثیق کرتا ہے۔

۶۲۱۹ مخطوط میں دو کتابیں شامل تھیں سکندر نامہ اور تحفۃ العراقین، مل کر ۱۰۸ ورق کا اندراج تھا۔ یہ صفی احمد صاحب کے مرتبہ رجسٹر کا معاملہ ہے۔ قاسم صاحب کے رجسٹر میں بھی یہ دونوں کتابیں درج ہیں۔ انہوں نے اہتمام مزید کیا ہے کہ سکندر نامہ کے ۲۶ ورق اور تحفۃ العراقین کے ۸۲ ورق الگ الگ لکھ دیے ہیں جو دونوں مل کر ۱۰۸ ہی ہو جاتے ہیں۔

وہ اوراق جنہیں ۶۲۱۷ نمبری اندراج میں 'ناقابل مرمت' ٹھہرایا گیا تھا، اتنا کہ اس کے اوراق کی تعداد کے اندراج کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا ـــــ نہ اندراج اوّل کے موقع پر، نہ اندراج دوم پر۔ وہ کسی مرحلہ پر خارج ہو جانے کے باوجود بھی اخراج ریکارڈ پر نہ لائے جانے کے سبب جب تیسرے ہاتھ پر پہنچی، تو اس پورے عمل کو نظر میں رکھ کے نتیجہ مرتب کرنے کے بجائے انھوں نے یہ بہتر سمجھا کہ ایک چھلانگ کے بعد کے نمبر ۶۲۱۹ میں شامل ایک کتاب کو اس خارج شدہ نمبر پر لے آئیں۔ چنانچہ ۶۲۱۷ نمبر ڈال کر اسے کتاب نمبر ۲۹۴۳ ٹھہرا کے اصل اندراج 'حکایات الصالحین' کی جگہ 'قران السعدین' کر دیا گیا۔ سہولت پسندی کے تحت ۶۲۱۹ ایک نمبر سمجھ میں آیا۔ اس لیے ایک نمبر پر ایک کتاب کے اصول کے تحت بظاہر مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ مزید اطلاع سامنے تھی کہ ۶۲۱۹ پر تو دو آئٹم پہلے سے درج ہیں 'سکندر نامہ' اور 'قران السعدین' ـــــ تو دوسرے کا کیا ہوگا۔ فوراً ہی حل نکالا گیا کہ یہاں بھی درج رہنے دو، وہاں بھی۔ پرانے زمانے میں اقطاب و ابدال کے بارے میں سُنا جاتا تھا کہ وہ بیک وقت دو جگہوں

پر موجود پائے جا سکتے تھے، لیکن ایک کتاب کے بارے میں کوئی کیسے مان لیتا کہ یہ دونوں جگہ بیک وقت موجود ہو سکتی ہے۔ اس اخر-الجھنے سے بچنے کے لیے ایک صورت نکال لی گئی۔ پہلے اندراج ملاحظہ ہوں:

قدیم پروگریس نمبر	قدیم کتاب نمبر	سید اطہر شیر کا مرسل نمبر	نام کتاب	مصنف	اوراق	سطور	خط
۶۲۱۷/	۲۹۴۳	۲۵۲۹	تحفۃ العراقین	خاقانی شیروانی	۸۲	۱۵	نستعلیق
(۳) ۶۲۱۹/	۲۹۴۶	۲۹۳۰	"	"	"	"	"

— دو نمبروں پر ایک ہی کتاب کی الجھن رفع کرنے کے لیے کچھ فرق کرنا ضروری تھا۔ نام میں فرق نہیں ہو سکتا تھا، نہ مصنف میں، نہ سطروں میں، نہ خط میں۔ لیکن اندراج کے تین خانے اور باقی تھے: ایک سنہ کتابت جس میں (تاریخ کتابت چونکہ مخطوطہ میں درج نہ تھی اس لیے سب کچھ مرتب کی صوابدید اور تخمین پر مبنی تھا) ایک جگہ تخمینی صدی ۱۳ لکھ دی اور فرق کرنے کے لیے دوسری جگہ ۱۱۔ کیفیت کے خانے میں بھی آزادی تھی، ملتے جلتے دو تین لفظ موجود تھے ایک اندراج کے تحت 'کرم خوردہ' لکھ دیا، دوسرے کے تحت 'بوسیدہ'۔ ان دونوں خانوں کے لیے تو جتنا [illegible] ہوا جا سکتا تھا، اس سے کام لیا گیا لیکن پھر بھی کسی کو شبہ ہو سکتا تھا کہ ۱۳ اور ۱۱ کی تخمین اور بوسیدہ اور کرم خوردہ کا بیان لازماً امتیاز پیدا نہیں کرتا خصوصاً جب خط اور اوراق کیا سطور کی تعداد بھی ایک سی ٹھہر چکی ہو۔ اس لیے اس کے بعد جو آخری خانہ امید بچا تھا اس میں پوری دیدہ دلیری کے ساتھ تین تین چار چار سنٹی میٹر کا فرق لے آیا گیا۔ ایک کا ناپ $\frac{۲۴ \times ۱۵}{۱۸\frac{۱}{۲} \times ۹}$ لکھ دیا گیا دوسرے کا $\frac{۲۱ \times ۱۲}{۱۳ \times ۶\frac{۱}{۲}}$ اور اب فہرست نگار صاحب مطمئن ہو گئے کہ فریب مکمل ہو گیا۔

واقعتہً 'حکایات الصالحین' کے اگر کچھ ربودہ اوراق قاسم صاحب کو ملے بھی تھے تو وہ ضائع ہو گئے صرف اندراج یادگار رہ گیا۔ اس طرح ۲۹۴۳ نمبر Redundant ہو گیا (جس پر فہرست ساز نے ۲۹۴۶ کو منتقل کرنے کی ناکام کوشش کی ہے)۔ جہاں تک 'قران السعدین' کا سوال ہے یہ ایک ہی نسخہ ہے، دو نہیں (جو اصلاً ۲۹۴۶ پر ہی تھا اور اب فہرست ساز کی کرشمہ سازی سے بیک وقت ۲۹۴۶ نمبر پر بھی ہے اور ۲۹۴۳ پر بھی)۔

••

محبوب حسین۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ

فوائدِ ضیائیہ

پُرانے فہرست نگار نے اس مخطوطہ نمبر ۸ ۱۷۱، پروگریس نمبر ۳۷۶۶ کو 'بلاغ المبین' مندرج کیا ہے۔ مختلف مقامات سے مخطوطہ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ "فوائدِ ضیائیہ" ہے (المعروف بہ شرحِ جامی) نہ کہ "بلاغ المبین"۔ چونکہ بلاغ المبین کا ٹائٹیل مخطوطہ پر لگا ہوا تھا، یہی اندراج کر دیا گیا۔ مخطوطہ کی عبارت دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی گئی۔ اگر اصل ٹائٹیل بیچ کو پلیٹ کر حمد و نعت پر ہی نظر ڈال لی جاتی تو مضمون سامنے آجاتا جس سے اندازہ ہو جاتا کہ 'بلاغ المبین' اس کتاب کا ٹائٹیل ہرگز نہیں ہے۔ 'بلاغ المبین' فارسی زبان کی کتاب ہے اور 'فوائدِ ضیائیہ' عربی کی۔ مخطوطہ کا اصل ٹائٹیل آخر میں موجود ہے۔

واضح ہو کہ یہ مخطوطہ دسنہ لائبریری سے آیا ہے۔ دسنہ کے رجسٹر پر دیکھا تو وہاں بھی اس مخطوطہ کا نام 'بلاغ المبین' ہی پایا۔ 'این خانہ ہمہ آفتاب است'

پس نوشت :۔ اوپر کی عبارت میں نے ۱۵ مئی ۱۹۷۸ء کے ایک اندراج سے نقل کی تھی۔ لیکن کچھ الجھاؤ ابھی باقی تھا۔ میں نے اپنی جستجو جاری رکھی یہاں تک کہ آج (۲ مئی ۱۹۸۲ء) کو خان صاحب کی روح سے رجوع کئے بغیر ہی بحمد اللہ یہ مسئلہ پوری طرح حل ہو گیا اور تازہ ترین تحقیقات کی روشنی میں دونوں کتابوں 'بلاغ المبین' اور 'فوائدِ ضیائیہ' کا سراغ مل گیا۔

بات یوں ہوئی کہ دسنہ سے کتابیں لانے کے لئے جن افسران کو بھیجا گیا وہ عربی، فارسی اور اُردو کے لوگ نہ تھے، بنا بریں وہاں سے اس لائبریری میں جو کتابیں ٹرک پر آئیں ان کی پیکنگ بہت عجلت میں کی گئی ہوگی جس سے غیر مجلد کتابوں کے اوراق آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔

واقعتہً دسنہ سے دو کتابیں آئیں، ایک فوائدِ ضیائیہ تھی اور دوسری 'بلاغ المبین'۔ بلاغ المبین فارسی کی کتاب ہے۔ شاہ رفیع الدین کی تصنیف۔ خدا بخش لائبریری میں ان دونوں مخطوطات کی آمد کے بعد پروگریس رجسٹر لکھنے والے صاحب اور ان کے بعد ہینڈ لسٹ بنانے والے صاحب دونوں نے فوائدِ ضیائیہ کو الٹ پلٹ کر نہیں دیکھا، اس کے اوپر بے شک بلاغ المبین کا پہلا ورق غلطی سے لگا ہوا تھا۔ لیکن دوسرے ورق پر باضابطہ فوائدِ ضیائیہ شروع ہوتی ہے اور تا اختتام موجود ہے۔ یہ بھی دیکھنا تھا کہ بلاغ المبین (پہلا ورق) فارسی میں ہے، جبکہ فوائدِ ضیائیہ تمام و کمال عربی میں ہے۔

اصل بلاغ المبین بھی —— یعنی پہلے ورق فوائدِ ضیائیہ کو بخش کے، دوسرے ورق سے —— لائبریری میں موجود تھی لیکن غلطی سے اس کا اندراج بھی مندرجہ بالا فہرست سازوں نے عربی میں کر دیا تھا جبکہ جیسا کہ یہ فارسی مخطوطہ ہے۔ اس بلاغ المبین کا سر بے تن تھا میں نے اس کا تنِ بے سر تلاش کر لیا ہے۔ اب یہ دونوں مخطوطے میرے ٹیبل پر خوشی میں باہم بغلگیر ہو رہے ہیں اور زبانِ حال سے مجھے دعائیں دے رہے ہیں —— آپ سے امید ہے کہ ان کی مسرت میں شریک ہوں گے اور ان بے زبانوں کی دعا پر آمین کہیں گے۔

(۴)

محبوب حسین : خدا بخش لائبریری، پٹنہ

کتاب الوصلة الی الحبیب فی وصف الطیبات والطیب

(کیٹلاگ نمبر ۹۶ - ایچ ایل نمبر ۲۱۹۳ - اوراق = ۱۸۲ - س ۹)

اِس مخطوط کا موضوع ہے : " الأغذية والأشربه وما يتعلق بها "

لائق و فائق کیٹلاگر (ڈاکٹر عظیم الدین احمد) نے اس مخطوط کو Dictionaries of medicine کے تحت رکھا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ موصوف نے اِس مجبوری سے اس کو عنوان مذکورہ میں داخل کر دیا کہ اس موضوع پر صرف یہی ایک کتاب اُن کو ملی اور ایک کتاب کے لئے لائق کیٹلاگر نے کوئی علیحدہ عنوان قائم کرنا مناسب نہ خیال کیا ۔ مخطوط میں درج ذیل عنوانات سے بحث ہے :

(۱) پانی کو خوشبو دار کرنے کا طریقہ اور جو ادویات اس میں مستعمل ہوں گی ۔ (۲) پینے کی چیزوں کا بیان (۳) حلوہ کی قسمیں، اجزاء اور تیار کرنے کا طریقہ (۴) روٹی، کلچہ، نان ختائی وغیرہ کے اقسام، ان کے اجزاء ترکیبی اور تیاری کا نسخہ (۵) غسل کا پانی، صابون و شیمپو وغیرہ (۶) زبان کا ذائقہ درست کرنے کے لئے عرقیات اور دوسری چیزیں ۔

کیٹلاگر صاحب نے سن کتابت کا اندازہ ۱۶ ویں صدی لگایا ہے ۔ میرا اندازہ بھی یہی ہے

مصنف :- کمال الدین ابو القاسم عمر ابن احمد العقیلی الحلبی ۵۸۸ ھ (۱۱۹۳ء) میں بمقام حلب پیدا ہوا ۔ حدیث، فقہ، معانی و بلاغت اور تاریخ میں کافی شہرت کا مالک ہوا ۔ تاتاریوں کے مظالم سے مجبور ہو کر مصر کی طرف رحلت کر گیا ۔

تعلیم :- دمشق، بغداد اور فلسطین میں تعلیم ... علم و فن کی شہرت اس حد تک بڑھی کہ "رئیس الاصحاب الامام العالم" کے نام سے پکارا جانے لگا ۔ ۶۶۰ھ ۱۲۶۲ء میں بمقام مصر وفات پائی ۔ ... ایک ضخیم تاریخ لکھنی شروع کی تھی ؛ ملا علی قاری طبقات حنفیہ میں لکھتے ہیں کہ وہ تاریخ مکمل ہو کر ۴۰ جلدوں میں ختم ہوئی ... نے اس کا خلاصہ "زبدة الحلب" کے نام سے تالیف کیا ۔

مخطوط کے آخر میں ایک مُہر پائی جاتی ہے : " الفقیر محمد بن شیخ محمود الواثق بالملک المعبود "

ان کے بعد ۶ ذی علم اصحاب کی تحریریں ہیں جنہوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ۔

وسیم احمد اعظمی
لائبریری کار ریسرچ یونٹ (یونانی)
(سی-سی-آر-یو-ایم)
خدا بخش لائبریری پٹنہ

(۵)

اٹھارہ رسائل کی جگہ بارہ

عربی مخطوطات کی مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۴۵۶، ج ۲ میں ہینڈ لسٹ م ۲۶۳۱ کے تحت ایک مجموعہ کا اندراج ہے جو ایک سو سولہ اوراق پر مشتمل ہے۔ مطبوعہ فہرست مجمل کے مطابق اس میں بارہ رسائل شامل ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

ہینڈ لسٹ م ۲۶۳۱/۱ التعلیقات
م ۲۶۳۱/۲ مقالۃ۔ شیخ منصور محمد بن محمد طرخون الفارابی
م ۲۶۳۱/۳ رسالۃ۔
م ۲۶۳۱/۴ التلویحات۔ شہاب الدین یحیٰ حبش السہروردی
م ۲۶۳۱/۵ رسالۃ فی الحروف۔ الشیخ الرئیس ابو علی الحسین بن عبد اللہ بن سینا
م ۲۶۳۱/۶ رسالۃ فی تحقیق الزاویۃ۔ " " "
م ۲۶۳۱/۷ رسالۃ فی بیان معنی الفلسفہ۔
م ۲۶۳۱/۸ الرسالۃ النیروزیہ۔ الشیخ الرئیس ابو علی الحسین بن عبد اللہ بن سینا
م ۲۶۳۱/۹ اجوبۃ المسائل العشرۃ۔ " " " "
م ۲۶۳۱/۱۰ رسالۃ فی النفس " " "
م ۲۶۳۱/۱۱ رسالۃ فی الکلیات۔ قطب الدین محمد بن محمد الرازی
م ۲۶۳۱/۱۲ رسالۃ فی العقائد۔ جلال الدین محمد اسعد الصدیقی الدوانی

لیکن اس مجموعہ میں ۱۲ کی بجائے ۱۸ رسائل ہیں۔ مطبوعہ فہرست مجمل میں جن رسائل کا اندراج نہیں ہے وہ رسائل جن کا اندراج ہے، لیکن اطلاعات نامکمل ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطبوعہ فہرست مجمل میں م ۲۶۳۱/۱ کے تحت "التعلیقات" کے مصنف کا نام درج نہیں ہے، حالانکہ مخطوطہ میں مصنف کی حیثیت سے الشیخ الرئیس ابو علی الحسین بن عبد اللہ بن سینا کا نام درج ہے۔ م ۲۶۳۱/۲ کے تحت

مخطوط کا نام "مقالة" تحریر ہے، جو ایک مجمل اطلاع دیتا ہے۔ حالانکہ مخطوط میں "مقالة الشیخ ابی نصر الفارابی رحمہ تعالیٰ فی الجمع بین رای افلاطن وارسطاطالیس" تحریر ہے۔ اس سے مقالہ کی نوعیت واضح ہوجاتی ہے۔ ۲۶۳۱/۳ کے تحت مخطوط کا نام "رسالة" درج ہے۔ حالانکہ مکمل نام "رسالة فی المبادی التی بہا قوام الاجسام والاعراض التی بہاستہ اصناف" ہے۔ ۲۶۳۱/۸ کے تحت "الرسالة الیزدوزیہ" تین اوراق پر مشتمل بتایا گیا ہے۔ جب کہ یہ صرف ایک ورق پر مشتمل ہے۔

مندرجہ ذیل وہ رسائل ہیں جو اس مجموعہ میں شامل ہیں لیکن فہرست نگار نے انہیں نہ گنتی میں لیا نہ اندراج میں:

ہینڈ لسٹ	۲۶۳۱/۳	رسالة لامعلوم الاسم	الفارابی	ورق ۴۷ ب تا ۴۸ الف
	۲۶۳۱/۴	"	"	ورق ۴۸ الف تا ۵۰ الف
	۲۶۳۱/۷	"	محمد بن محمد بن الحسن الطوسی	ورق ۶۹ الف تا ۹۴ ب
	۲۶۳۱/۸	رسالة فی علم الواجب	محمد بن محمد	ورق ۹۷ الف
	۲۶۳۱/۹	اربعة وعشرون مسائل	نصیر الدین الطوسی	ورق ۹۸ الف تا ۱۰۱ الف
	۲۶۳۱/۱۲	رسالة لامعلوم الاسم		ورق ۱۰۶ الف تا ۱۰۷ ب

احمد یوسف پٹنہ - ۸

عنایت خاں راسخ کے سلسلے میں

ادھر خدا بخش لائبریری جرنل ۱۷ میری نظر سے گذرا۔ آپ عنایت خان راسخ کے بیان میں لکھتے ہیں:

" تفصیل اخلاف خان راسخ و برادرش شاکر خاں بتفصیل ذیل حاصل شدہ "

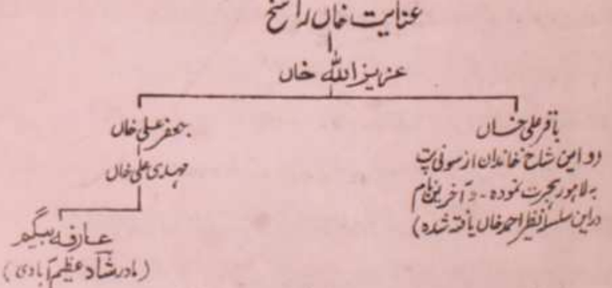

یہ بیان غلط ہے کیونکہ خود میری دادی باقر علی خاں صاحب کی پڑپوتی تھیں، تفصیل درج ذیل ہے:

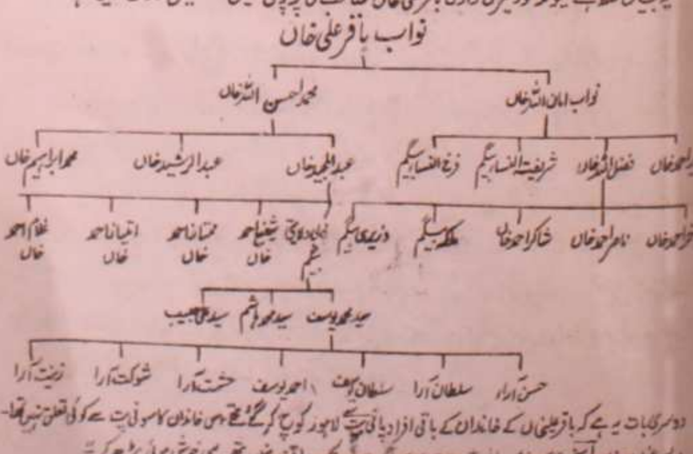

دوسری بات یہ ہے کہ باقر علی خاں کے خاندان کے باقی افراد پانی پت سے لاہور کوچ کر گئے تھے اس خاندان کا سونی پت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔
ویسے عنایت خاں راسخ کے contributions سے ہم لوگ ابھی تک واقف نہیں تھے۔ بیحد خوشی ہوئی پڑھ کر۔

رشید حسن خاں
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

"تدوینِ متن کے مسائل" کے بارے میں

①

جرنل کا شمارہ ۱۶ ملا، شکرگزار ہوں۔ بلاتکلف کہتا ہوں کہ یہ کارآمد نمبر ہے، خاص کر ایم فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلبہ کے لیے۔ جو کمی تھی وہ آپ کے مفصل تبصروں نے پوری کر دی۔ اس طرح اصولی بحثیں بھی آگئیں اور عملی مشقیں بھی فراہم ہوگئیں۔ البتہ ایک بات یہ ضرور ہے کہ دیوان راغب والا تبصرہ ۳۰۳ کی رائفل سے چڑیا کے شکار والی بات ہوگئی۔ جو لوگ غیر مکلف ہیں، وہ نہ آپ کے مخاطب ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں نہ ہمارے۔ دوسرا تبصرہ بالکل درست اور برحق!

البتہ املا کا مسئلہ آپ کی توجہ کا اب تک طلبگار ہے۔ کاتب صاحب نے اصل کی پابندی نہیں کی اور مصحح نے بھی بے پروائی کی۔ مثلاً آپ میرا ہی مضمون لیجیے: ص ۳۴ "اسی لیے" "کام کرنے والے کے لیے" (ایضاً) "اس وقت انہی" (ایضاً) ص ۳۶، س ۷: "انہوں" ص ۳۹، س ۸: "بجائے" س ۹: "انہی"۔ س ۱۲: "گنجی کش"۔

ایک جگہ کتابت یا یادداشت کی ایک غلطی نے میرا مفہوم ہی بدل دیا۔ میں نے کہا تھا کہ ۲۸۰ لفظوں میں سے تین لفظ ایسے تھے جن کی تصحیح کما حقہٗ نہیں ہو سکی۔ لیکن یہ جملہ جس طرح معرضِ تحریر میں آیا ہے، اُس سے بات بدل گئی (ص ۱۳۳۔ ص ۳۹، س ۲۲: "آج شناسا نہیں" غالباً "ہم" چھوٹ گیا ہے۔ البتہ اسی صفحہ پر ایک غلطی ایسی ہے جس کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ س ۵ پر "پانچ نسخے ایسے ضرور موجود ہیں" میں "پانچ" کی جگہ مجھے "چار" لکھنا چاہیے تھا۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس خاص نمبر کو آپ (اپنے معمول کے مطابق) کتابی صورت میں بھی چھاپ دیجیے۔ یہ نصابی ضرورتوں کے کام آئے گا۔ اس کی بڑی ضرورت ہے۔ غلط نامہ ضرور آخر میں شامل کر دیجیے گا۔

اس تدوین نمبر کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ آپ اسی انداز کا اور اسی پیمانے پر ایک تحقیق نمبر بھی مرتب کر دیں۔ یعنی پہلے ایک مذاکرہ ہو اور پھر اُسی کے مقالات اور مباحث کو اسی طرح ایک خاص نمبر میں مرتب کر دیا جائے، اس طرح تکمیل ہو جائیگی۔ لیکن اس بار موضوعات کا تعین کر دیا جائے، تاکہ تکرار نہ ہو مفاہیم کی، (جو اس نمبر میں ہوئی ہے) مثلاً اس طرح: (۱) تحقیق، تنقید اور تدوین کی تعریف (۲) روایت اور شہادت کا فرق اور ان کے احکام (۳) تحقیق کی زبان (۴) کیا تحقیق مثبت اور منفی ہوتی ہے (جیسا کہ بعض نابالغ لکھتے ہیں) (۵) تحقیق اور اخذِ نتائج اور اس کے حدود۔ وغیرہ۔

رئیس نعمانی
پرشین اکیڈمی، لکھنؤ

(۲)

تدوین اور طبع موزوں: میری نظر میں آپکا مقالہ پسند آیا شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ بہت دنوں سے یہ موضوع خود میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا جس پر آپنے قلم اٹھایا اور سلیقے سے مضمون لکھا۔ یہ علمی و ادبی تاریخ کے ناخوشگوار ترین واقعات میں سے ہے کہ اکثر نااہلوں کو مواقع اور وسائل مہیا ہو جاتے ہیں (مثال کے طور پر آپکے "سیمنار" میں بعض ایسے لوگ بھی شریک کئے گئے جو کسی طرح ڈگری اور لکچرر شپ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جانے کے باوجود نہ فکری نثر لکھ سکتے ہیں اور نہ شعر کو موزوں پڑھ سکتے ہیں)

جرنل ۱۶، ص ۱۳۱ پر "فی القیٰمۃ سعیھم مشکور بادا" میں قیم قیمت کی جمع نہیں ہے بلکہ "قیامت" کے املا کی ایک شکل ہے جس میں "ی" پر اشباعی زبر ہوتا ہے۔ "فی" "القی" اور ضمیر "ہ" سے مرکب نہیں ہو سکتا ————————۔ اس لیے کہ اس صورت میں لقی پر "ال" کا استعمال عربی قواعد کی رو سے درست نہیں ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ "سعیھم مشکور" قرآن کی ایک آیت سے ماخوذ ہے۔ اور وہ آیت قرآن میں جس جگہ آئی ہے، وہاں کئی آیات سے "قیامت" ہی کا ذکر چل رہا ہے اور سعیھم مشکور بھی اسی ذیل میں وارد ہوا ہے۔ اور اسی لیے شاعر نے "فی القیٰمہ" کہا ہے جو اس وقت کے رائج املا کے مطابق "فی القیٰمہ" لکھا ہے۔ اور قرآنی رسم الخط میں آج بھی اس کا املا یہی ہے۔

ڈاکٹر کلیم سہسرامی
راج شاہی یونیورسٹی بنگلہ دیش

قمر گیاوی وغیرہ کے بارے میں

(۱)

آپ کے 'جرنل' کے (۱۰-۱۱) شمارے میں قمر گیاوی پر آپ کا مختصر نوٹ نظر سے گزرا، مجھے تعجب ہے کہ آپ کو یہ التباس[۱] کس طرح ہوا کہ قمر صاحب مولانا محمد علی مرحوم کے انتقال (۱۹۳۱ء) تک زندہ تھے۔ موصوف آخری عمر میں نیا مکان بنا کر سہسرام ہی میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے تھے اور میرے پڑوس کے محلہ میں تھے۔ ۱۹۶۰ء تک میں اُن سے ملتا رہا ہوں۔ زبان و بیان اور فن شعر کے بہت سے نکات بھی ان سے سیکھنے کا مجھے فخر حاصل ہے۔ 'فرہنگ آصفیہ' کے غالباً پہلے ایڈیشن پر ان کی تقریظ پڑھنے کے لائق ہے اور اسی نسخے میں سیّد احمد دہلوی کی تحریر قمر صاحب سے متعلق موجود ہے، جس سے زبان و بیان اور لغت نویسی کے فن پر موصوف کی قدرت و صلاحیت کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قمر صاحب کی شخصیت اور اہلیت پر ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے، اُن کا نادر کتابخانہ اب بھی محفوظ ہے کہ نہیں جس میں قلمی اور مطلّا و مذہب نسخے بھی تھے؟ آپ دلچسپی لیں تو سہسرام کے کسی سرکاری افسر کے ذریعہ اُن کا کتابخانہ آپ کے یہاں منتقل ہو سکتا ہے۔

(۲)

"آپکے جرنل کا ۱۶واں شمارہ مطالعہ کے بعد لطف آ گیا، جن لوگوں کو قاضی صاحب نے بخش دیا تھا، ان کی ٹانگ آپ نے کھینچ لی اور حضرات کے مضامین میں نظریاتی بحثیں ہیں، آپ کا مقالہ "تدوین و طبع موزوں" علمی تحقیق کی اچھی مثال ہے۔ اسی قسم کا ایک مضمون حضرت قمر گیاوی کا لکھا ہوا میرے پاس اب تک محفوظ ہے، اس میں بہار کے اکثر اساتذہ اور شعرا کے کلام کی تنقید دیکھی ہے۔ اور ایک علاحدہ مستقل مضمون "گل نغز" بھی ہے۔

چند جگہ مجھے آپ سے جزوی اختلاف ہے، مثلاً انگریزی الفاظ کا استعمال "کنفیوژن" (ص ۸۳) "چیک کی جا سکتی ہیں" (ص ۸۳) میرے خیال میں یہ مفہوم ادا کرنے کی اردو میں صلاحیت ہے۔ اگر یہ کام آپ انجام نہ دیں گے، تو دوسروں سے کیا توقع رکھی جائے۔ ص ۸۳ (۷) ذکر بعضی اشخاص کہ بارگی ہماں ... الخ۔ ایرانی اس طرح لکھتا ہے "ذکر بعضی (از) اشخاصیکہ با ..."

۱۔ التباس نہیں صحیح تاریخ کا علم نہ ہونے کے سبب یہ تعین کی ایک کوشش تھی کہ کم سے کم اس وقت تک ضرور زندہ تھے (ادارہ)

مسترت حسین آزاد (رامپور)

رسالہ "ادیب" الٰہ آباد" کے بارے میں

خدا بخش لائبریری جرنل تقریباً دیکھ لیا۔ آپ نے بہت اچھا اور کام آنے والا مواد جمع کر دیا ہے۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ نے لکھا ہے کہ "ادیب" جنوری ۱۹۱۰ء سے جولائی ۱۹۱۳ء تک کا انتخاب ہے حالانکہ انتخاب میں شماروں کی جو تفصیل دی گئی ہے اس میں جولائی ۱۹۱۳ء کا کوئی شمارہ نظر نہیں آتا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ تو ممکن ہے کہ جولائی ۱۹۱۳ء کے شمارہ کا کوئی مضمون آپ نے انتخاب کے لائق نہ سمجھا ہو اس لیے فہرست میں بھی ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری بات سمجھ میں نہیں آتی۔

ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی نے بھی رسالہ "ادیب" پر ایک تعارفی مضمون لکھا ہے، جو "قومی زبان" اپریل ۶۴ء میں شائع ہوا ہے، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ادیب کا آخری پرچہ جون ۱۳ء میں شائع ہوا ہے۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ غالباً سکسینہ صاحب سہواً ایسا لکھ گئے ہیں، کیونکہ آپ کے لکھنے کے مطابق آخری شمارہ جولائی ۱۳ء کا ہوا۔ لیکن فہرست میں اس ماہ کے شمارہ کا کوئی ذکر نہ ہونے کی وجہ سے سکسینہ صاحب کے مضمون کی طرف پھر خیال جا رہا ہے۔ آپ اصل وجہ سے مطلع فرمائیں۔ ممکن ہے سمجھنے میں مجھ ہی سے کہیں غلطی ہو رہی ہو۔

••

○

ادارہ:۔ سکسینہ صاحب کا خیال اور آپ کا شبہ صحیح ہے جولائی غلطی سے لکھا گیا۔ اسے جون ۱۹۱۳ء پڑھا جائے۔

محمد عمر سیفی
امیر گنج، ٹونک

غزلیات سلمان ساوجی - استدراک
کے بارے میں

جرنل ص ۱۶۱ میں پروفیسر ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی کے مضمون غزلیات سلمان ساوجی، پر آپ کا نوٹ بعنوان "استدراک" نہایت مناسب رہا۔ کوئی کوئی شعر حاشیہ نمبر پاجانے کے باوجود رہ گیا۔ مثلاً ص ۶، ص ۲۸، ص ۴۷، ص ۶۸، ص ۸۸، ص ۱۰۸، ص ۱۳۹ پر نمبر غلط لگ گیا، جبکہ ۱۳۰ پر لگنا تھا۔ ۱۳۲ رہ گیا۔ شعر ص ۱۳۶ پر نمبر رہ گیا۔ ۱۳۹، ۱۴۷، ۱۴۸ استدراک میں چھوٹ گئے۔ ۱۶۲، ۱۶۵، ۱۶۸ اور ۱۶۹ پر نمبر تو پڑ گئے مگر تشریح واستدراک میں نہ آسکے۔ علیٰ ہذا، آگے کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ غالباً غیر ضروری تھا اس لیے عمداً چھوڑ دیا گیا۔

ادارہ: اشعار پر نمبر صرف سہولت اور اشارے کے لیے ڈالے گئے تھے تاکہ ہر صفحے پر کسی بھی شعر کی تلاش میں آسانی ہو۔ یہ نمبر لازماً اس امر کا اظہار نہیں کرتے کہ اس پر کوئی نوٹ بھی دیا جا رہا ہے۔ البتہ متعلقہ شواہد سے فوراً تلاش ہو سکتا ہے۔

نئی کتابیں

علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں - از سید ابوالحسن علی ندوی

یہ وہ خطبہ ہے جو کشمیر یونیورسٹی کے ساتویں کانوکیشن منعقدہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری پیش کیے جانے کے موقع پر پڑھا گیا

یہ خوشی کی بات ہے کہ ہماری جامعات نے جو قدیم کے مقابلہ میں جدید علم کا سرچشمہ خیال کی جاتی ہیں مدرسوں سے وابستہ علماء کی قدر و قیمت بھی پہچاننی شروع کر دی ہے۔ اگرچہ یہ اس وقت ہوا جب مدرسوں سے وابستہ ایک ہندوستانی عالم دین کی عرب ممالک میں بڑے پیمانے پر پذیرائی شروع ہوئی ——— اس مختصر خطبہ سے جو کُل ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے ایک طویل لیکن اہم اقتباس 'جرنل' کے صفحات میں محفوظ کر دینا مناسب ہوگا، جو درج ذیل ہے :

"جامعات کا پہلا کام سیرت سازی ہے، یونیورسٹی ایسا کیرکٹر بنائے جو اپنے ضمیر کو بقول اقبال ایک کفِ جَو کے بدلے میں بیچنے کے لئے تیار نہ ہو، آج کل کے فلسفے اور نظام یہ سمجھتے ہیں کہ اس بازار میں سب کی قیمت مقرر ہے، کوئی اگر کم قیمت پر نہیں خریدا جاسکتا تو زیادہ قیمت پر خرید لیا جائے گا! ایک جامعہ کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ وہ سیرت سازی کا کام کرے، وہ ایسے صاحب علم افراد پیدا کرے جو اپنے ضمیر کا سودا نہ کر سکیں، جن کو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی تحریبی فلسفہ، کوئی غلط دعوت و تحریک کسی دام خرید نہ سکے، جو اقبال کے الفاظ میں پورے اعتماد و افتخار کے ساتھ کہہ سکیں :

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں — غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن — کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

دوسرا فرض یہ ہے کہ ہماری جامعات سے ایسے نوجوان نکلیں جو اپنی زندگیاں حق و صداقت اور علم و ہدایت کے لیے قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، جن کو کسی کے لیے بھوکا رہنے میں وہ لذت آئے جو کسی کو پیٹ بھر کر کھانے اور "نائے و نوش" میں آتی ہے، جن کو کھونے میں وہ مسرت حاصل ہو جو بعض اوقات کسی کو پانے میں نہیں ہوتی، جو اپنی جوانی کی بہترین توانائیاں، ذہن کی بہترین صلاحیتیں اور اپنے جامعہ کا بہترین عطیہ جس سے ان کی جھولی بھر دی گئی ہے انسانیت کو تباہی سے بچانے کے لیے صرف کریں۔ دانش گاہوں کو دیکھنا چاہیے کہ وہ اعلیٰ صلاحیت کے لوگ کتنی تعداد میں پیدا کر رہی ہیں؟ میں صفائی سے کہتا ہوں کہ اب کسی ملک کی یہ تعریف نہیں کہ وہاں بڑی تعداد میں یونیورسٹیاں ہیں، یہ کوتاہ نظری اب بہت پرانی ہو گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ علم کے شوق میں جستجو کی راہ میں علم و اخلاق کے پھیلانے اور برائیوں، بداخلاقیوں، سفاکی و درندگی، دولت

و قوت کی پرستش کو رد کرنے کے لیے کتنے آدمی اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں؟ اپنی قوم کو صاحب شعور، مہذب اور باضمیر قوم بنانے کے لیے کتنی تعداد میں نوجوان موجود ہیں جو اپنی ذاتی سربلندی اور ترقی سے آنکھیں بند کرکے اس مقصد کے لیے اپنے کو وقف کرتے ہیں۔ اصل معیار یہ ہے کہ کتنے نوجوان ایسے ہیں جو دنیا کی تمام آسائشوں اور ترقیوں سے آنکھیں بند کرکے کسی گوشے میں ٹھوس علمی و تعمیری کام کر رہے ہیں؟!!

شریفانہ انسانی زندگی گذارنے کا بنیادی فن، خدا ترسی، انسان دوستی، ضبط نفس کی ہمت و صلاحیت، ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دینے کی عادت، انسانیت کا احترام، انسانی جان و مال، عزت و آبرو کے تحفظ کا جذبہ، حقوق کے مطالبہ پر ادائے فرض کو ترجیح، مظلوموں اور کمزوروں کی حمایت و حفاظت اور ظالموں و طاقتوروں سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ، ان انسانوں سے جو دولت و جاہت کے سوا کوئی جوہر نہیں رکھتے، عدم مرعوبیت و بے خوفی، ہر موقع پر اور خود اپنی قوم اپنی جماعت کے مقابلے میں کلمۂ حق کہنے کی جرأت، اپنے اور پرائے کے معاملہ میں انصاف اور ترازو کی تول، کسی دانا و بینا طاقت کی نگرانی کا یقین اور اس کے سامنے جواب دہی اور حساب کا کھٹکا، یہی صحیح خوشگوار و بے خطر اور کامیاب زندگی گزارنے کی بنیادی شرطیں اور ایک اچھے اور دلکش اسلوب معاشرہ، اور ایک طاقتور محفوظ و باعزت ملک کی حقیقی ضرورتیں اور اس کے تحفظ کی ضمانتیں ہیں۔ اس کی تعلیم اور اس کے لیے مناسب ماحول مہیا کرنا دانش گاہوں کا اوّلین فرض اور اس کا حصول تعلیم یافتہ نسل اور ملک کے دانشوروں کی پہلی ذمہ داری ہے اور ہم کو اسی جیسے تمام مواقع پر دیکھنا چاہیے کہ اس کام کی تکمیل میں ہماری دانش گاہیں کتنی کامیاب اور ان کے سند یافتہ افراد و فضلا کتنے قابل مبارکباد ہیں؟ اور آئندہ ان مقاصد کے حصول اور تکمیل کے لیے ہم کیا عزائم رکھتے ہیں؟ اور ہم نے کیا انتظامات سوچے ہیں۔"

●●

قاضی عبد الودود (بار۔ایٹ۔لا)
پٹنہ

تبصرہ

فرہنگ آصفیہ (۵)

[اگر صفحے کے شمار کے بعد کوئی نشان اختصاری نہ ہو، تو لغت آصفیہ میں بطور لغت شامل نہیں۔ شمار کے بعد "بس" ہے تو اس سے یہ مراد ہے کہ لغت بغیر سند ہے، اور "س" ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سند ہے، مگر ناکافی۔ ق = قافیہ]

(۶۲) دیوان ناجی، مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق ۱ تا ۱۳۶

۱ بہیا "عباس لے کے مشک چلا ہے فرات پر" ص ۳۱۲، "کیا ڈر ہے موت سے" (سیتی' چاہیے، ورنہ مصرع ناموزوں، اسے بہیا (کذا) ہے یہ، ۲ اتفاقاً قافیۂ ناقا وغیرہ۔ "بعضے میں بختیوں کے آگے یہ اتفاقاً" ص ۱۳، تنوین کے ساتھ قافیۂ ناقا (ناقہ) نہیں ہو سکتا۔ اتفاقاً مثل اصلا' ہے، ۳ نستارنا (ماضی دیوان میں) "اے عزیزاں دکھا کے چہرہ ورخ" ص ۹ "آج مہر دنی مجھ کو نستارا"، ۴ پھاٹنا = پھٹنا "رشک سیں دل کلی کا جاوے پھاٹ" ص ۶، ۵ پشیمانی کھینچنا "کھینچتا ہے دل پشیمانی ہنوز" ص ۱۰۵، ۶ آشیانی = آشیانے والا "دام میں بوالہوس کے آیا نہیں" ص ۲۴۲ "کیونکہ یہ باز آشیانی ہے"، ۷ ہات = ہاتھ (بطور قافیہ) "موت ناجی کی پیارے اب تمہارے ہات ہے" ص ۲۸۸، ۸ رشوت خور "جب سے جشتی ہوا ہے رشوت خور" ص ۳۳۲ "بس"، "سب نے ٹھہرا دیا ہے کالا چور"، ۹ تلاوا "کم ڈوبتا ہے لشکر جب گرد ہو تلاوا" ص ۴۲ "بس"، ۱۰ صاحب (بکسرۂ با) قراں "سکہ ہے مہر خاں میں اس صاحب قراں کا" ص ۶ "بس"، ۱۱ نستارا = چھٹکارا (آصفیہ) "باپ دھلی پایا نستارا" ص ۱۳ "بس"، ۱۲ دہ بالضم = دہ بالفتح "دہ بالضم میں دیا مجھ لوگ کی روٹا یار کو مردہ گیا" ص ۱۷، ۱۳ گھیرا "ہر اک شہر و سما جاتا ہے میرے دل کی وسعت میں" ص ۱۹ "بس"، "الٰہی روز محشر تک رہے جو آباد یہ گھیرا" ۱۴ مقراضی جلوا "کوئی بوسہ نہ تھا اس لب کا مقراضی تھا وہ جلوا" ص ۲۱ "س"، ۱۵ عاسا (حاشیے میں آسا) = عصا "بجولا قیام زاہد مسجد میں توڑ عاسا" ص ۲۳، ۱۶ شیوہ لینا کسی امر کا "شیوہ لیا ہے من نے کافری کا" ص ۲۴، ۱۷ دہکانا "حبث ناجی کا دل غیرت سیں انگارا سا دہکایا" ص ۲۵

١٨ پھالسا = فالسہ ' شکر کی شربت ہو پر او کو بجھے ہی پھالسا (کذا) ص٢٦ ' ١٩ چکنا بالضم کی اترا ضوبر
اور ترا بالا ہوا چکنا ' ص٢٨ ، ٢٠ مکان ہارا = مکان والا ٢١ فاقہ کھینچنا ' ہم کھینچتے ہیں فاقہ مرجا مکان ہارا ' ص٢٤
٢٢ ایتا = اتنا ٢٣ جھلا ' ہوا ہی گرد غم اور اشک حسرت کا ایتا جھلا ' ص٣٥ ٢٤ بہروپیا
' جس کی نیرنگی ستی حیران ہے بہروپیا ' ص٢٦ ' بس ' ٢٥ صافا دینا ' داڑھی کو ' تو آنکھوں میں لیکن
داڑھی کون دیکر صافا ' ص٣٩ ، ٢٦ اضافہ پانا ' یہ سورما سپاہی پاتے ہیں نت اضافہ ' ص٣٩ ٢٧
بیذق ' اتر اہی شطرنج کی بیذق کیں فرزی کری ' ص٥٠ ۔ ٢٨ کا = کا بیٹا ' بنا ہے اب مرزی کی حاضری دہ
نانبائی کا ' ص٥٩ ، ٢٩ آچار بالف ممدودہ ' دیکھو آچار کون تیلی کے یہاں دعوی ہے رائی کا ' ص٥٩ ' بس '
٣٠ سجیلا ' اوس سیج کو سجیلا سی اکڑ کون سکو گا ' ص٦٢ ' بس ' ٣١ ستید بیای مشدد مفتوح
' لذت اس دنیا کی کم لی حق نے تب ستید (ق) ، کیا ص٦٣ ' کہ ہے طالب کون مرشد کی جفا ایلاف کی صورت
ص٨٠ ، ٣٢ اغنیا ' کیوں اغنیا میں شر کا لی ہے صلا عبث ' ص٨١ ، ٣٣ افرنج = فرنگ ' دیکھا اس طرح
چین اور افرنج ' ص٨٣ ، ٣٤ تاری = تاریک ' خوف میں رہیو عزیزان اوس شب تاری سیں آج ' ص٨٣
٣٥ دود = دودھ ' تیری ہونٹوں سیں ابھی آتی ہے ہر دم بوی دود ' (ق) ص٨٨ ، ٣٦ بیر لگانا ' کیوں
نہ مٹی کتیں لگا وی بیر ' ص١٠٣ ، ٣٧ تمن = تمھن ' پیار کرگنہ تمن کا نہیں جو یہ دو دادو
ص١٠٦ ' بس ' ٣٨ سہاور ' جلدی بدن سیں مل جاتا نہیں سہاور ' ص١٠٧ ، ٣٩ سینچر سر چڑھنا
٤٠ جمّا = جمعہ ، ٤١ تھاور = سینچر بی پر رہو گے کب تلک جب پڑھا سینچر ' ص١٠٧ ۔ طالعوں سیں
میری پھرا جما نہیں تھاور ' ٤٢ جاور ' ہیں عیب پوش دونوں ہلدی ہوں یا جاور ' ص١٠٧ ، ٤٣ جناور
= جانور ' موندی نہ چونچ دانا کھیرا اگر جناور ' ص١٠٧ ' ٤٤ غیور زمی مشدد ' ٤٥ ڈھیر ' خدا غیور ہے یہ ہے شرف کا تی کو ڈھیری پر ' ص١١٢ '
٤٦ مردم شکار ' لیکن عجب ہے ناجی مردم شکار یہ باز ' ص١١٥ ، ٤٧ اختصاص رکھنا کسی سے ' چھوڑ
کر جو دیجو خوشہ امن سیں رکھو اختصاص ' ص١٢٠ ، ٤٨ رصاص (نسخہ مطبوعہ میں اصاص) ' گر یہی لالچ
میں پانی ہو گیا مثل رصاص ' ص١٢٠ ، ٤٩ رجل (مطبوعہ نسخہ میں اجل اور مصرع ناموزوں) ' ہے ہونس
' لیک شعلوں میں رجل ہوتی ہے شمع ' ص١٢٢ ، ٥٠ اعتکاف بیٹھنا ' جان جوں مسجد میں بیٹھا ہے ہلال اب
اعتکاف ' ص١٢٨ ، ٥١ خوش غلاف ' باندھ رکھا انکھیوں کا ڈورا جو یہ کتے خوش غلاف
ص١٢٨ ' بس ' ٥٢ رانگ ' نام سن اکسیر کا مت کھل مت مثل رانگ ' ص١٣٥ ' بس '

۵۲ شکیل 'خوشنما ہر شکل میں دیکھا نہیں ایسا شکیل ص۱۳۷ بس ، ۵۳ دودھیل ' لات
میٹھی ملی کی گائی جو پالے دودھیل ص۱۳۹ س ' ۵۵ لئیل ' اور ہوتا ہے نہار اون کا جا ہوتی ہے لئیل ' ص۱۳۹ ۵۶
ارذل ' لگن کا داغ کھا کر پیو کی خود مر گیا ارذل ' ص۱۴۰ ۵۷ وقر ' مسکین یتیم سوں کا اس میں وقر نہیں ' ص۱۴۸
بس ، ۵۸ انبیاؤں (جمع الجمع بسیاق اُردو) ' سرتاج انبیاؤں کا ختم رُسل کتیں ' ص۱۵۲ (رُسل جمع)
۵۹ جواہر بکسرہ ہا (اصل میں بفتحۂ ہا) ' کہ جا ہے آبرو دیکھو سیں گر بکھری جواہر (ق) ہوں ' ص۱۶۰ ، ۶۰
ببری (مطبوعہ میں بیری) ' مجھ کوں دیکھو جو شیر کی نظروں ص۱۶۱ بس ' جب ستی ببریاں
دکھائی ہیں ' ۶۱ جوائی (مطبوعہ میں جوائی) ' شوخ چنچل بڑی جوائی ہیں ' ص۱۷۱ ۶۲ اسلوب ' جو دل کو کھینچ کر
کا اسلوب جانتے ہیں ' ص۱۶۶ ۶۳ اعمالوں (جمع الجمع) ' جھومیا گر حشر کر دن اپنے ہی اعمالوں سیں ' ص۱۷۹ ۶۴ امولا
' بہامت دیکھو جا یہ سب موتی امولا ہیں ' ص۱۷۳ ، ۶۵ بتیاں (جمع) ' تو برگ نرگس اوپر بجا ہے نکھوں
جو اپنے سجن کوں بتیاں ' ص۱۷۷ ۶۶ رتیاں (جمع) لگو جو کانٹا نظر میں سُونا کٹیں گی گیسو یہ کالی
رتیاں ' ص۱۷۷ بس ، ۶۷ چھتیاں (جمع) ' بناؤ بنتا نہیں ہے ناجی جو اس سجن کوں لگاؤ چھتیاں ' ص۱۷۷
۶۸ پہلوان بہ ہائے متحرک و لام ساکن) ' یہ سندھا تھا لگی مجھ کوں پہلوانوں سیں ص۱۷۹ اُس '
۶۹ ڈنڈ بیل ' کہ جاتی ہے دہیوں پکڑ اک ڈنڈ بیل کے سیں ص۱۸۳ بس ، ۷۰ جُز دان ' آج لڑکو
بھول گئے مکتب میں کل جُزدان کو ' ص۱۸۹ بس ، ۷۱ مزاحم ' کب ذکر مزاحم ہو کلاہ بشری کو ص۱۹۰
س ، ۷۲ واشگاف ' ہم سیں دو حرف واشگاف کرو ' ص۱۹۲ ۷۳ رکت (خون) ' یہ پیک نئیں کسی کا
گویا رکت ہو یاد رو ص۲۰۲ بس ، ۷۴ وہ بالفتح = وہ بالضم ' انصاف سیں بعید ہے یارب نہ یہ نہ وہ
(قافیہ رہ) ص۲۰۴ ۷۵ فردی ' مول بڑھتی جس قدر گوہر کا ہو فردی سیں ہے ' ص۲۱۶ ۷۶ جان کندنی
' ہر ہر ولا کو ہکن سیتی جان کندنی کوی ' ص۲۱۸ بس ، ۷۷ مرس ' سوئی سیں ایک پانی میٹھا ترا
مرس ہے ' ص۲۲۰ ۷۸ کماہی ' دل میں میرے تڑپ کماہی ہے ' ص۲۲۳ ۷۹ ایاغی ' مئے وحدت کا وہ ایاغی ہے ' ص۲۲۳
۸۰ ناخواندی (مؤنث) ' جو لڑکا مار پیکر نکتہ فہم اور خوش طبیعت ہو - ' کھلی ہے اس سے جو میری بغل میں
ہوئی ناخواندی ' ص۲۳۵ ، ۸۱ ماندی (مؤنث) ' کہ بھوجتی ہو اوس کی طبع سو کیں درد میں
ماندی ص۲۳۵ رس ، ۸۲ گھاٹنا = گھٹنا ' کہ پہنچا منزل کے تئیں کارواں بچتی رہے گھاٹنے ص۲۳۸ ، ۸۳
بھونرالی جامن ' کنول کھل جائے گا جو دیکھ لے جامن ہے بھونرالی ' ص۲۴۹ ، ۸۴ مچی (قافیہ ستی) ' کہ مجھ اپنے
لب سیں دی مچی ص۲۵۰ ، ۸۵ چپل (مطبوعہ چپل) ۸۶ چھندی ' ہے کٹیلا چپل بڑا چھندی '

ص ۲۵۲، ۸۷ خارائی (اسم مجرد) "کہو اس سنگدل سیں باغ میں آ چھوڑ خارائی" ص ۲۵۸، ۸۸ مردی
پکڑنا، "کرم نے صحبت رنداں میں جا پکڑی ہے اب مردی" ص ۲۶۱، ۸۹ چھکر چھوڑنا "خبر تھی پھلجھڑی کی
اب لگا دہ چھوڑی چھکر" ص ۲۶۵، ۹۰ چدی (مؤنث) "یہ ادرخانا ہے چال اس کی چدی ہے" ص ۲۶۹
بس، ۹۱ لابدی (بدال غیر مشدد) "نہیں رہتا بنا دیکھ بتاں کو" ص ۲۶۹، بس،
"کوئی کیا دل مرا یہ لابدی ہے" ۹۲ جزرسی "نئیں خال وخط کو حال سیں زلف اس
کی بیخبر" ص ۲۷۵، بس، "سر داد فوج حسن کی وہ جزرسی ہیں ہے" ۹۳ تھکی (کاف مشدد،
ماضی) "جب ان انکھیوں سیں ہار کر تھکی" ص ۲۷۷، بس، ۹۴ بن چکی "آسماں ہو چلا ہے بن چکی" ص ۲۷۷،
۹۵ حب الوطنی "پا بزنجیر ہوئی مجھ کو یہ حب الوطنی" ص ۲۷۸، ۹۶ بامن ۹۷ پوتھی ۹۸ الٹی پلٹی "بامن
سیتی پڑھا ہو پوتھی، وہ الٹی پلٹی" ص ۲۸۰، بس ۹۹ نقصی "بے وقت کیوں نہ اتری احمد کنیں تحفات" ص ۲۸۱ (کذا)
"ایک بات میں دکھی ہے میرا کلام نقصی" ۱۰۰ بلہاری "جو دیکھی اب تری کاکل کو بل جاتی ہے بلہاری" ص ۲۸۳
بس، ۱۰۱ رہگذری (مطبوعہ میں نہ ہے) "خوش آوے کس طرح ناجی کو ایسا حسن رہگذری"
ص ۲۸۷، بس، ۱۰۲ انگارا (بنون غنہ) "نہ پوچھو گل ہے دل عاشق کا یہ جلتا انگارا ہے" ص ۲۸۸
بس، ۱۰۳ جاسوسی "کرکے کمخواب سو جاتی کی یوں پاتے ہیں جاسوسی" ص ۲۸۹ (کذا) بس، ۱۰۴ منہ چھلاوا
"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہاں ہے منہ چھلاوا ہے" ص ۲۸۹، ۱۰۵ عرض نیوش "وہ بادشہ بادشہ خوباں ہے
خوباں جو عرض نیوش آوے" ص ۲۹۰ ۱۰۶ ناتواں بینی "برا سا عیب ہے انسان میں یہ
ناتواں بینی" ص ۲۹۱، بس ۱۰۷ نکدار (نوکدار) "کہ اس کو سر اوپر نکدار چیرا (چیرا صحیح) ارغوانی ہے" ص ۲۹۲،
۱۰۸ امرتی "دہن تیرا پستہ اور لب شیریں امرتی ہے" ص ۲۹۳، ۱۰۹ ایزدی "جو نظر بندی نہیں تو یہ ہے فضل ایزدی"
ص ۲۹۵، ۱۱۰ سرمدی "جو تو چاہے ہو تیرے قبضے میں ملک سرمدی" ص ۲۹۵، ۱۱۱ اباحت "قول وفعل
اس کوں سب اباحت ہے" ص ۲۹۶، بس، ۱۱۲ بہاری "کانٹوں میں لوٹتے ہیں سب
غنچۂ بہاری" ص ۲۹۷، بس، ۱۱۳ لاگا = ماضی = لگا) "کبھو لاگا میں نہیں جاتی کا اس میں خیر ہے" ص ۲۹۸،
۱۱۴ جبید (قافیہ مرید) "نوشت میں فلک ہے ترا اکثرین جبید" ص ۳۰۰، ۱۱۵ خوید "گھوڑی تری نہ کھائی
گر اور کھیت کی خوید" ص ۳۰۰، بس، ۱۱۶ نبید "پیالی تری ہیں میکدۂ فیض کی نبید" ص ۳۰۰، ۱۱۷ امر
"دشمن کو تیری عمر کی بیل امر کوے" ص ۳۰۳، بس، ۱۱۸ کھٹارٹ غیرمشدد) "تیری کی آنسیتی

دل اون کا کھٹا ہوتا ہو، ص ۳۰۷ ، ۱۱۹ اوپر (واو تلفظ میں نہیں) ' فرزند مرتضیٰ کے اوپر فاتحہ پڑھو
ف ۲۱۰ ، ب ۱۲۰ انسیت ' تو یہ ہنگامہ ہے باقی انسیت کا کمال ہے ص ۳۱۱ ، ۱۲۱ دریاؤ (= دریا ،
۱۲۲ تیرے حسن کا دریاؤ نہیں بہنے کا ' ص ۳۱۷ ۱۲۳ سہاونا ' دو دکھیں سہاونے یہ ڈھول ص ۳۲۳ ، بس ' ۱۲۴ کلابتون
بھیگی ہے اس لباس میں اور ہی کلابتون ' ص ۳۲۸ ، ۱۲۵ چلتہ (مطبوعہ میں چلنا) ' سیاہی کے
کتیں برسات ہو چلتہ کے ابرو سیں ' ص ۳۳۰ ، بس ' ۱۲۶ بڑکا ' چمن میں صبح کو ہنستے
سنا جو بڑکے کو ص ۳۳۳ ، بس ' کلی پکاری کہ شاباش تیرے بڑکے کو ' ۱۲۷ مکڑی
' مجھ ڈر ہے کہ مت بس جاوے یہ مسجد کی مکڑی ہے ص ۳۳۷ ، بس ' ۱۲۸ اندھیرا ' خدا حافظ رقیبوں سیں یہ
اندھیرے کی لکڑی ہے ص ۳۳۷ ، بس ' ۱۲۹ چاہی ' یوسف اوس کا اسیر چاہی ہو ' ص ۲۲۳ ، ۱۳۰ بکتری
' اس بکتری کی تیغ ہے معطل اتو کے ہاتھ ' ص ۲۰۵ ، ۱۳۱ ہمن ' جوں نیشکر ہوا ہے قلم اب ہمن کے ہاتھ ' ف ۲۱۰
۱۳۲ لاچارگی ' سخت حاجت ہو تو لاچارگی ہو جاضرور ص ۱۰۵ ، بس ' ۱۳۳ اسنا (قافیہ) =
آشنا ' دیر ہے زلف کی ناگن تیرے منہ سوں سدا اسنا ص ۵۶ ، ۱۳۴ دیتا (ماضی) ' کہ اِتی سوہن
مژگاں سیں میرے دل کتیں دیتا ' ص ۵۵ ، بس ' ۱۳۵ قیافہ ہونا کسی کام کا ' اوس سبز خط کو
کب ہے خط پڑھنے کا قیافا ' ص ۳۹ ، ۱۳۶ مرافہ (ر غیر مشدد) ' دیکھا نہ اور دیکھا میں گرچہ سب مرافا ' ص ۳۹

(۶۳) نفس اللغۃ از میر علی اوسط رشک : ۱ تا ۱۰۰ آصفیہ

رشک (متوفی ۱۲۸۴ھ) ، شاگرد ناسخ اپنے وقت کے مشہور زبان شناس تھے۔ ان کی فرہنگ اردو
مسمّیٰ بہ نفس اللغۃ (= ۱۲۵۶ھ) کا قلمی نسخہ میں نے کتبخانۂ آصفیہ (اب کوئی اور نام) میں دیکھا
تھا، اور اس کے متعلق ایک یاد داشت لکھ لی تھی، مگر اس وقت نفس اللغۃ کا حصۂ اول (از
الف-تا-ت) ' طبع لکھنؤ پیش نظر ہے۔ "بہت محقق" محمد حسین آزاد کی آبِ حیات میں رشک کا
ذکر ہے، مگر مؤلف کی " انسائیکلوپیڈیا اِن اُردو " میں رشک اور ان کی فرہنگ کے ذکر کی جگہ
نہ نکل سکی۔ قریب بیقین ہے کہ مؤلف کی نظر سے یہ کتاب نہیں گزری۔

۱ آڑ پاڑ = اعتماد سست باشد کہ از کسی گیرند ۲ آسمان کا تارا ۳ آسی =

فرش کو چکتر بود موافق نشستن کہ آنرا گسترانیدہ، عابدانِ ہنود پرستش سازند ۴ آغوں
۵ آکھر = جای ماندن بہایم ۶ آٹھواں = روز ہشتم بعد ہولی کہ مردمان آن روز بجای معین جمع
شوند۔ آصفؔ میں اٹھواں کا میلا، دریای لطافت میں آٹھوں ہر ۷ اٹھوانس = ہشت پہلو ۸ اچاری
بالف مقصورہ آصفؔ میں بالف ممدودہ ۹ آکھلاپن = شوخی و شرارت اسپ .. کہ سواران را از
آن سبب از پشت خود جیندازد۔ (مصرع "آکھلاپن ہے سمند ناز کا") اچوک (چوک سے) ۱۱ ایریا =
رنگ کبوتر ۱۲ اونگھائی = انگھائی، اونگھ سے ۱۳ ایڑ بھیڑ = خریدن و فروختن اجناس
و اسباب .. و کنایہ از تباہی و سرگشتگی ۱۴ اچھوتا پنڈا ۱۵ آکھلی = گو و نشیب راہ باشد
کہ پیل از آن صدمہ خورد ۱۶ آگ پر لکڑی سیدھی کرنا ۱۷ آگ دبانا ۱۸ آگ کا درخت =
مدار کا درخت ۱۹ آگا تاگا = محاورۂ زنان ۲۰ آگ چھوڑ بچھو دوڑ، آصفؔ 'بس'۔
۲۱ آلھا ۲۲ آنکھ مچولا ۲۳ ابری تفتا = رنگی باشد از کبوترانِ سبزہ ۲۴ اپنایت، آصفؔ میں
اپنائیت ۲۵ اجمود = دوا .. ۲۶ ادرسا = قماش .. ۲۷ ادلا = گوشت ساقِ حیوانات
باشد کہ آن ریشہ ندارد ۲۸ ادھ بچی ۲۹ ادھیا = نصف ماہانہ بود کہ بشرط نوکری بکسی دادن
کنند۔ ۳۰ اڈیان = دریا پوشہای ٹاٹ بافی کہ پارچہ ہای بانات بجای پاشنہ دوزند۔
۳۱ ادھیلچا ۳۲ اڑا = قسم زبون ترئی : ۳۳ اڑابہ = اسبابِ خیمہ و توپ و مانند آن بر
آن بار کردہ دہند و زگاوان کشیدہ برند ۳۴ اراک = درخت .. ۳۵ اردلی اترنا =
گاییدن چندکس باشد یک زن را در یک جلسہ ۳۶ اردلی بازار = بازاریست در لکھنؤ،
و اصل این لغت آنست کہ ہرگاہ پادشاہان ہند سفر میکردند، در ہر مقام بازاری برای خرید اجناس
و اسباب ضروری برای مردمان سواری مقرر میشد ۳۷ اڑا گوڑی = ضد و شرارت ۳۸ اڑبڑ =
ناہمواری و نشیب و فراز راہ ۳۹ اڑ = خللِ معدہ .. ۴۰ اڑم = انبار ہر جنس ۴۱ اسکاتر =
انگریزی لفظ .. ۴۲ اسگند = بخیست اندک تلخ، و بہترین آن ناگوری است ۴۳ اکپولیا
۴۴ اکرنگ = یکرنگ ۴۵ اکلیل الملک = گیاہ قیصر ۴۶ اک منزلا ۴۷ اکھنڈ = اسپی
کہ دندانِ شیر شکستہ باشد ۴۸ باجن = ساز نواختن ۴۹ باراں کوٹ ۵۰ بارگیر = کسی کہ
براسپ خود نوکر کنانند ۵۱ باڑھیا (باڑھ سے) ۵۲ بازی ہرنا ۵۳ بازی ہروانا۔

۵۴ بالاکپی = ایک آلہ .. ۵۵ بالوکی دوات ۵۶ بانج آصفہ میں بانجھ ۵۷ بالی بھولی
۵۸ بانا = چیزی از رشتہ بافند، و در پای کبوتران گردان دارند .. ۵۹ باندا = مرضِ درخت
.. ۶۰ باندغلام ۶۱ باندھنوں، آصفہ میں باندھنو ۶۲ باہرا = دستی در چوب بازی ۶۳ بائی =
بادی .. ۶۴ ببر = برندۂ موی یا ہای اسپ و شتر ۶۵ بتاسں پھیتی ۶۶ بتام، آصفہ
میں بوتام ۶۷ بتر بازی ۶۸ بٹ ٹرائی = امتحان سنگ ترازو (ٹرائی انگریزی لفظ معلوم
ہوتا ہی ۶۹ بٹوائی ۷۰ بٹے بازی (زبانوں پر اسی طرح)، آصفہ میں بٹابازی ۷۱ بجھاوٹ =
تیز کردن کار دو شمشیر ۷۲ بجھایا پانی ۷۳ بجھرا = ظرف .. ۷۴ بچوگڑا ۷۵ بغچی = بقچۂ کوچک
۷۶ بدبومرد ۷۷ بدبورنڈی ۷۸ بدھاہوا = مسرور ۷۹ بڈہرا بڈہری = گیاہ ۸۰ براچیتنا
۸۱ براد = بیزاری ۸۲ بہرانا = پاشیدن ۸۳ برنا ۸۴ برنیا = برف فروش ۸۵ برک،
انگریزی لفظ = کسی کہ قابل کار کردن نباشد ۸۶ برکر، عربی = حوض ۸۷ برگد کی ڈاڑھی
۸۸ برنگا = تختہای کوچک .. ۸۹ برودٹ = مرض .. ۹۰ برہا = جای کہ در آن آب از
چاہ و تالاب آمدہ و روان شدہ در کشت و زراعت رسد۔ بکسیر یا بزبان قصبہ سرایدن الفاظ
فراق ۹۱ بریتا = رسن گندہ .. ۹۲ بڑدنکھا = نیشکر .. ۹۳ بڑباگڑ = شیرہ .. ۹۴
بڑ بڑیڑی = بزرگان اموات .. کہ فاتحۂ آنہا در ہر تقریب شادی التزام زنانست ۹۵
بڑھنیا = کبوتر .. ۹۶ بڑچچی ۹۷ بڑسولہ = قرص سفید کہ از شکر سازند ۹۸ بڑکا ۹۹
بڑکنا ۱۰۰ بڑیل : آنچہ برای پختہ کردن سقف و بام اندازند از ریزہ ہای خشت و سفال -

••

particulars given in the three inscriptions" and ignoring the usual hyperboles, one can say that the warrior saint's name was Ibrahim, the son of Abu Bakr; that he was a Syed, popularly called Ibrahim Bayyu; that he was entitled Saif-ud-Daulat; and that he was the Maqta of Bihar. See also Dr. Ahmad's fn. No. 3 on p. 38 of the above book about the Mahoris.

9. See also a note of Dr. Z. A. Desai in Epigraphica Indica, (Arabic and Persian) in 1955-56 and also the Urdu book already referred to regarding the word Bayyu.

10. Sirat-i-Firozshahi, translated and edited by the present writer.

11. Chandayan, edited by Dr. Permeshwarilal Gupta.

12. Journal of Bihar and Orissa Research Society, 1919 p.p. 31-43.

—: o o :—

can one account for the date, 1415=1355, of Sanskrit inscrption, two years after the clearly stated date of his death, Sunday 13th Zilhijja, 753 (20th January, 1353) ?

Was not Malik Mubarak, the warrior Chief and the Lord of Dalmau (U.P.), quite different from the husband of Ruqayya and said to be the nephew of Malik Bayyu ? (e) The Urdu book gives the translation of a Farman granted by emperor Muhammad Shah in the 6th year and renewed in the 13th year of his accession in 1143 A.H. The grantee, Badrus Salam; is said to have been a direct descendant, on the daughter's side, of Malik Ibrahim Bayyu, and the word Saiyed occurs in it. A son of Badrus Salam, named Darvesh Ali was given the offices of 'Qaza' (Judiciary), Ihtesab (censorship of morals), and Khitabat (sermonisation). Keeping in view the great distance of time between the 14th and 18th centuries, and the transformation that takes place of facts and events at the hands of those who have a tendency for magnification and laudation of their ancestory, one may be pardoned for not taking such thingverys seriously.

References—

1. Peer-Pahari is named after Syed Ahmed called Peer-Pahar. See Blochmann's note JASB 1873.
2. Buchanan's an account of the District of Patna in Bihar 1811-12.
3. Vide Quraishi's Ancient Manuments in the Province of Bihar and Orissa : also A.S. of Indian Seres 1931.
4. Ravenshaw's article in JASB VIIIth, 1839.
5. Epigraphica Indica (1892) gives the text of one inscription.
6. Dalton ET : Ethnology of Bengal. It records a current tradition, which is exactly similiar to that found in the case of other saintly personages. e. g. see the writer's paper in Bengal, past and present, Calcutta, on the mausoleum of Mamu-Bhanja at Jaruha, Hajipur.
7. Martin's Eastern India 1838.
8. Dr. Q. Ahmad writes in his valuble book, Corpus of Arabic and Persian Inscriptions of Bihar "piecing together the

Malik Mubarak (d) About the campaigns, the first was led by Malik Bayyu in 749 under the directions of emperor Muhammad Tughlaq against some Hindu refractory chieftains of Chai champa in Hazaribagh region. The second compaign was led against Bithal who is said to have been a petty ruler of Bihar who had oppressed and fleeced the Mahuri Merchant of Mathura who subsequently settled down in Bihar and still commemorate the relief offered to their ancestors. The third and the most important compaign was led against Hans Kumar, who was probably a Cheru Chief with his strong hold in Rohtas. On the occasion of a visit to Nalanda Bargaun the Hindu Chief had killed the son of a muslim lady on whose complaint Malik Ibrahim was sent to Bihar to Chastise the Rajah. After repeated and bitter struggles the Rajah was killed; but his people who had dispersed, took the Malik unawares from behind and killed him, suddenly coming out from their ambush. The corpse of the warrior saint was brought and burried on the hill top of Biharsharif. There is a bare reference to the successful raids against the Chakwar pirates on the Begusari side of the Ganges But the family records of the Chakwar bear witness to the struggle.

Both the authors have drawn upon the observations of Hazrat Arshad of Jaunpur in his late 17th century book, Ganj-i-Arshadi, which we have already considered. There are several questions well worth consideration, why is there a complete absence of all references in contemporaneous Sufic Literature to Malik Bayyu ? Why are the verses on the mausoleum completely devoid of any reference to his descent from the Prophet of Islam, or his death as a *shaheed* or martyr ? The verses are only partially helpful, viz. the Maqta of Bihar, Malik Saif Daulat (the sword of the state), Safdar Saf Shikan (the breaker and the arranger of ranks). Madar-i-Mulk Ibrahim Bubkr (Malik Ibrahim son of Abu Bakr and the pivot of the realm). The day and date given in it is 13th Dhul Hijja 153 A.H. Dr. Qeyamuddin rightly observes that there are good reasons to believe that Ibrahim Bayyu served under Muhammad Tughlaq, but he died in the time of his successor Firoze Shah Tughlaq. Dr. Ahmad has described Malik Ibrahim as the governor in Magadh on behalf of Firoze Tughlaq. Can the Maqta of the Persian and Mandaleshwar of the Sanskrit inscription be taken as analogoues ? How

Safar, has a reference under the date 1st Jamadi I 762 A.H. It tells us that "Salah Mukhlis, Naib-i-Ghaib-i-Daud Khan" came to offer his congratulations to Makhdum Sharafuddin on the occasion of the first (Ghurra) of the month. He had brought some sweet smelling flowers in a towel (Rupak) for the saint; but the latter issued his 'Farman' that It should be distributed among those who were present in this assembly. The word 'Ghaib' or 'Ghaibat' requires further thought. Did it mean that Salahuddin (son of Mukhlis) deputised for Daud in the latter's absence, was the compiler of Munis-ul-Muridin and the same engineer who built the fort for Firoze Shah in the Saran district ? Much depends upon the establishment of the identity of Asadul Haq-wa-d-din Daud Khan referred to in these inscriptions. Was he the eldest son of Malik Ibrahim Bayyu ?

The two books; Riyadh-un-Naim by one who claimed direct descent, in the twentieth generation, from Malik Bayyu, and the larger work, Tarikh-i-Malik, represent attempts in modern periods to furnish a biographical sketch of the life and activities of their alleged ancestor who lies buried on the hill in Bihar. Besides the three inscription of the mausoleum, with six and twelve verses on slabs fixed on the eastern and southern entrance, and twelve more on a slab which was removed to Calcutta museum, the writers of these books in Urdu have banked upon two genealogical tables or Shajara they found in the Zafarabad and Islampur Khanqahs. The present writer had seen the Islampur Shajara which did not appear to be very old. The light shed on the warrior saint in these two books come to the following points (a) Malik Bayyu was directly descended, in seventh generation, from Ghaus-i-Pak, Abdul Qadir Jilani, who was a Hasani Husaini Saiyed, and the founder of the Qadri Order of Sufis. (b) Malik Bayyu came from But Nagar in the vicinity of Ghazni whence came also Bibi Ruqayya, said to have been the grand daughter of Jaliluddin, one of the four brothers of the celebrated Makhdum Sharafuddin Maneri (c) Besides seven sons, Malik Bayyu had left two daughters, one of them, Bibi Mahinyan, was married to Zafarabadi Saint, Sadruddin Chiragh-i-Hind, not a Saiyed like Saaduddin Aftab-i-Hind, who was connected by marriage with the ruling chief of the Saiyed dynasty of Bengal; and the other was the wife of his brother's son, named

scattered, scarce inscriptional stone slabs, the most important and complete is that which belongs to a mosque, dated 765 or 13 by, and is now attached to the chiraghdan of a tomb in Ambair Dargah. It says that the sacred structure had been raised during the "Ayalat" (Governorship) of Asadul Haque wa-d-Din Ulugh-i-Azam Daud Khan". Was this Daud, the eldest of the seven sons referred to in Ganj-i-Arshadi; and should he be taken as the successor of Malik Bayyu ? What about the Chaghtai title given to him ? Was it due to the dignified position he occupied ? An earlier in-scribed stone slab, transferred from Bihar to Calcutta museum, refers to the time (Waqt) of Khanzada Sulaiman (bin) "Ulugh Daud Khan"; Another fragmentary stone which Dr. Qeyamuddin brought out from the debris piled up in the Dargah of Shah Qumais, Bihar, giving, like the others, the name of the reigning Sultan Firoze Shah Tughlaq, tells us about the identity and connection of these personages with Malik Bayyu. Can it be taken as a fact, as has been done by some scholars, that Daud was the son and successor of Malik Ibrahim Bayyu and ruled from 753 to 765 as Governor of Bihar, and he was succeeded by his son, Malik Sulaiman, and the latter had a son, Malik Sirajuddin mentioned in an undated inscription in the Dargah of Shah Qumais. We can concede that the juxtaposition of name is indicative of *ibniat or kunia* (that is patronym taken from father). But we need stronger and more certain evidences to fortify the facts of the alleged cnnections between them and the main subject of this paper.

Reference has been made above to the inscriptional stone attached to the gate of a Dargah in village Tajpur Basahi in the old Saran district. This partially mutilated black basalt stone was originally attached to a strong Fort (Hisn-i-hasin) built by Sultan Firoze Tughlaq in 774 in old Saran. It is worth-while to mention here that the builder or engineer who built this Fort, names himself as Salah Mukhlis Daud Khani, and it was the same person who compiled an important Malfuz of Makhdum Sharafuddin Maneri, named Munis-ul-Muridin, and it contains the same date 775. His honoured spiritual guide was so pleased that he took off from his head his own turban and put it on his head. Salah Mukhlis was really Salahuddin son of Mukhlis Khan who described himself as Daud Khani. Another Malfuz, called Malfuz-us-

said to have been a high class noble. Neville, the compiler of the old Jounpur Gazetteer refers to a rare work, Manaqib-i-Darweshia, only a few pages whereof were fortunately shown to the present writer by a representative of the family. It appears that there was 'Musaharat' (Marriage relationship) between the family of Malik Ibrahim Bayyu and the well known contemporary saint, Sadruddin 'Chiragh-i-Hind Zafarabadi (Jaunpur). This lends some support to the claim of honoured ancestry put forward by Malik community for the warrior saint of Bihar.

Buchanon, the English traveller, in his report of 1811-12, tells us that he visited the mausoleum on the Bihar hillock which he described as a structnre of rather crude construction, a quadrangular with sloping walls and a clumsy dome. Surprisingly enough, Buchanon, has mado no mention of the Persian Inscriptions on the mausoleum and on the sides. He refers to twenty five houses of people claiming intimate connection with, and attached to, the tomb. They described themselves as the hereditory 'Mujavirs' or 'Khuddams' (Custodians, Keepers, Servants), devotedly employed for lighting and cleaning the mausolsum and the surrounding area which was studded with pucca tombs.

The writer feels indebted to his ex-pupil and friend, Dr. Ved Prakash of Guru Gobind Singh Collego for supplying the copies of certain archival documents in the Patna Secretariat Library, consisting of 'Rubakars' or court proceedings, and also of a 'Mahzarnama' or petition with attested signatures of all those who were present on the occasion. The documents bore the dates, 1847-48. The petitioner, Panah Ali and some others, claimed to have enjoyed the 'Muhtarifa', that is duties levied on certain trades and occupations on yearly or monthly basis, for services rendered in connection with the Mazar of Syed Ibrahim alias Malik Bayyu, built 51o years back. The difference of a decade and a half must be taken as an approximate estimate. Some may take the use of the word Syed here as conjecfural rather than real; but the persistence of the traditions, still cnrrent, cannot be ignored.

We may now turn to the evidences furnished by epigraphic sources, and also certain allusions in Sufic literature which may be clothed by some with a sense of actuality. Of the scanty, stray

went together for we have at least some rare cases in the history of Khaljis of Delhi; one is that of Syed Wahiduddin, and another is that of Qutbuddin Quraishi, and both were called Malik. The difficulty in settling the question of lineage and position arises when we are confronted with the question of the immediate successor of the warrior saint, who had the epithet of Ulugh-i-Azam added to his name. Will not one be justified in presuming that he was one of the best representatives of the central Asian adventurers who came sometime during the reign of Md. Ibn Tughlaq; that the Sultan deputed him to protect the weak and the distressed against the strong and the refractory chiefs, oppressors, pirates and plunderers, and by sheer force of his right arms he swept over the whole of Bihar, north and south, chastising and vanquishing a Chero chief of Rohtas, the Chakwar pirates of Samoh in Begusarai region, and some tribal chiefs in Chhotanagpur area ? It is the long continued and persistent local traditions which may lead one to such suppositions or presumptions. But presumptions cannot be treated as actuality. Why is it that nowhere in any of the epigraphs, there is not the slightest indication of his career and achievements, the manner his death as also of his Arab origin and antecedents ?

There is very little beyond the names of Malik Bayvu and some others in the Jain temple Sanskrit inscription of Rajgir, and in the Awadhi poem, Chandayan of Mulla Daud. The former, noticed by P. C. Nahar, in J.B.O.R.S., Patna, in 1919, is dated 6th day of Asarh, 1412 V.S., corresponding to 1355, that is two years later than the date of the inscriptions of the Bihar mausoleum. It first eulogises the reigning sovereign, "Sultan Phiroj Saha of Dilli, the ruler of the world, and the protector of the good, with his lotus feet and the shoots of rays emanating from jewels of his turban. The 2nd and 3rd names which occur in the inscription are those of the "Mandaleshwar (Governor) Malika Bayyu", and of his "Sewaka" (Assistant), a new name, Masarat-ud-Dina (Nusrat-uddin) who probably deputised for him in Rajgir. As for Chandayan which is a story of Lorik and Chanda, composed by Maulana Daud (Daud Kab Jo Chanda Gayee) in 781 (Baras Sat Sai Hoi Ekasi), under the auspices of Khan-i-Jahan Jouna Sah, the Prime Minister, (Jauna Sah Ojir Bakhana) of "Sah Phiroz Dilli Surtana." It mentions Malik Baya along with his son Malik Mubarak, who is

is not Daud but Malik Mubarak who has been mentioned as the great noble and son of Malik Baya "Malik Baya Put Udharan Dhiru; Malik Mubarak tahan Ke Meeru". He is 'randhir in yudh' (war), a Sringar (adornment) of the royal army, and, he is superb both in war and liberality.

Despite all these facts and allusions, we have still much about Malik Baya or Bayyu that is hazi, mazi and bewildering. There is a good deal of confusion about his origin and antecedents, earlier habitation, racial extraction, motives, purposes and occasions of his advent in India, the great deeds that he performed, and the circumstances that led to his death. The epigraphical or inscriptional evidences tell us of something as to who he was, what was he like, his virtues and his fight for his faith; but not as to when and whence he came and why ? We are not in a position, on the basis of all that we have, to say, what his ancient lineage and honoured ancestory was which the local traditions, still current among those who claim direct descent from him, ascribe to him.

Let us try to see what the inscriptions say. The text with the translation have been published, but we may consider here only those words and expressions, which are suggestive of certain essential features, and flash new light. Some of these are as follows : Madar-i-Mulk (the pivot or the centre of the realm); Malik Saifi-i-Daulat, (the Lord of the sword and the state); Safdar Safshikan (keeper and breaker of ranks); Brahim bu Bakr (Ibrahim the son of Abu Bakr); Maqta-i-Bihar (the feudal Lord or the Military Governor of Bihar). The lofty and high sounding epithets and appellations and the expression "Hami-i-Deen" (defender of the faith) "Kuni Diwar-i-Khakash ra Muattar" (make the ashes of its wall fragrant) have their own meaning and value. There is, however, not the slightest indication, in any of the line, whether he was a Syed or a Tatar Turk with the appellation of Ulugh-i-Azam, and as to how he fought for his religion and wh ere.

Significantly enough, there is no such thing as Ulugh or Khan, a Chaghtai or Turkish title, nor Mir or Syed which are well known Arabic words. One cannot say that Mir and Malik never

the undertaking by lifting up some bricks for the building. Surmises drawn from juxtaposition of things found scattered side by side, or the local traditions, uncritically taken for granted, by a pious but credulous writer cannot be a safe and helpful guide in establishing the identity of the venerable figure lying within the mausoleum in Kaghazi Mahalla. All that can be said is that he must have been a highly respected personage, once a cynosure of people, a centre and object of homage, attention, allegiance and reverence so as to attract somebody, possessed of power and means, and capable of raising a splendid spacious mausoleum of such a size and so solid as to defy the wear and tear of times after a lapse of more than six centuries.

As regards, the warrior-saint, Malik Ibrahim Bayyu, lying buried on the Bihar hillock, the subject of this paper, there is no such historic uncertainty as to require a mere conjectural reconstruction and any elaborate process of re-instatement and re-establishment of his personality. Apart from the three versified Persian inscriptions on his mausoleum, we get a rare Sanskrit inscription on a stone tablet which once adorned the top of a Jain temple on the Rajgir Hill. All these furnish us with direct evidence about our hero and his individuality. Though, there is a total lack of contemporaneous historical writings, throwing any light on the subject, and the fairly copious Sufic literature produced in Bihar in the 14th and 15th century is also completely devoid of all mention or references about him and his performances, there is a very important reference in a unique contemporary manuscript, Sirat-i-Firoze Shahi, available in Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna. Among other nobles, mention has been made of Daud (bin Malik) Bayyu. The doubling of the word 'Daud', (Da'ud Ibn Da'ud) a name of considerable importance, was probably a mistaken insertion by the scribe. There is another documentary or literary, and a-near-cotemporary, evidence, in the Hindi poem, named Chandayan, composed in 781 by Mulla Daud of Dalmau, in Rai Breily District (U.P.). The name of a Daud and possibly his successors occur in some of rare scattered inscribed stone slabs. One is found on a Chiraghdan of a tomb in the Amber Dargah, Bihar-sharif, and another is on the gate of a Dargah in Tajpur Basahi in Saran District, lal belonging to the time of Firoze Shah Tughlaq. In Chandaya nit

laid in eternal sleep in their burial vaults in Bihar town, one on a hillock called Peer Pahari, and another in Kaghazi Mahalla. Something definite and certain, but not much, can be said about the former, but there is little or nothing except a single, solitary, lean and later evidence to bank upon about the latter. Both belonged to the 14th century and died one after the other. The essential features of the Tughlaq style of architecture, the sloping wall, is possessed by both the structures. While the larger or more spacious and imposing mausoleum in Kaghazi Mahalla is completely bereft of all internal evidence, inscriptional or otherwise, about the respected personage lying in eternal rest in it; and it is devoid even of a socket or hollow which could have been indicative of an inscribed slab, the case is different about the smaller domed mausoleum on the hill for it was provided with as many as three inscribed slabs on the entrance wall and on the sides. The magnificient mausoleum is ascribed by a well-known Sufi saint of Jaunpur, the author of Ganj-i-Arshadi, a late 17th century work, to a pious and scholarly personage named Shah Muhammed Badh Seistani. Round about the mausoleum ascibed to him, there appears to have been once a cluster of buildings which in course of time toppled down. Some inscriptions of the Sultanate and the Mughal times are still found on the wall of a Qanati or roofless mosque. Of these one is that of Sultan Ibrahim, the Sharqi King of Jaunpur, and it is dated 807. Lying here and there, within the demolished walls andenclosure, in the proximity of the mausoleum, one canstill find many painted and polished marble slabs of Persian pattern, and on the way of the mausoleum, one can see the broken pieces of a black basalt stone pillar of ancient times. The Sufi saint of Jaunpur must have blindly accepted the local traditions which were still current in his time about the venerable Seistani scholar who, according to the same writer, was an elder contemporary of Makhdum Sharafuddin Ahmad Maneri, and also probably his teacher. We are told that the Makhdum occasionally came to the place to offer his Fatiha to the departed soul. There is a self conflicting statement made by the author of Ganj-i-Arshadi that when Malik Ibrahim Bayyu died, and Daud, the eldest of his seven sons, began to build his mausoleum, Makhdum Sharafuddin, Shah Muhammed Badh Seistani and Ahmad Chirmposh came to bless

man of high distinction, bearing lofty appellation such as "Khan-i-Kabir, Tahamtan-i-be-nazeer" (the great Lord and the peerless warrior), "Ulugh Taghi Khan bin Boghra Khan". Is there anything anywhere to enable us to establish his identity and flesh, clothe and animate the grey powdered stuff of his decayed bones ? A broken stone slab, found lying in the gate of a house in Bihar town, mentions the reigning King, Firoze Shah Tughlaq, and conatins an expression which is as much attractive as it is inexplicable. This is the "Hajib-i-Hinduana-i-Mamalik". Does it mean, the chamberlain in charge of the Hindus of the realm ? Have we heard of any such official functionary ?

The elements for the composition of historical works or biographical accounts are generally sought in writings coming down from contemporary chronicles of events, and stress is laid on both contemporaneity and credibility. There are many pitfalls such as bias, prejudices, predilections and sentiment of conceit, and of magnifying the lineage and ancestry of somebody. There is also a lack of facts and sense of continuity and chronology. But a student of history doing something in the sphere of research would not feel deterred either by the paucity of materials or other defects and difficulties. He knows that facts and circumstances are rooted in the soil of records, which may be documentary, epigraphical or archaeological. It is not an easy task to reach an absolute truth regarding something that had happened in the distant past. But he would not give up his pursuits and would like to grapple with the problems facing him. Even the meagre and later evidences have some value, and the flashes which have circumstantial and inferencial implication cannot be totally ignored. One would welcome whatever looks like a new and un-expected light and has some bearing on the aspects of his subject of enquiry. In the absence of solid facts he would try to draw certain inferences helpful for the knowledge of the facts, knowing full well, however, that even after being carefully weighed and examined his surmises may turn out to be groundless testimony, and nothing better than mere suggestions or suppositions.

With a view to find out the truth let us try to grope in the light and darkness, in remote past, regarding two venerable figures,

illustrated by copiously quoted verses and apt stories and anecdotes. Devoted followers and disciples like Zain Badr Arabi, Ashraf Rukn Balkhi, Salah Mukhlis Daudkhani, and others who were present in the Majlis or the Assembly, compiled the collections of the sayings or the discourses of the master and also of the letters written by his own hand by the Shaikh and addressed to distantly placed disciplies.

Although, we are fortunate to have somewhat copious contemporary supply of evidances high-lighting the activities and influences of the Sufi mystics and Shaikhs, principally of the Firdausi and the Shuttari orders, and occasionally flashing certain ideas on something of socio-religious and cultural interests, but these are largely views and thoughts rather than what could be enshrined in history as systematic records and continuous narrative. Besides that, have we got all that emanated from the pen and lips of the spiritual leader ? For example, there is nowhere any trace now of the correspondence of Makhdum Sharafuddin and Sultan Sikander Shah of Bengal, which has been referred to in his Maktubat by Maulana Muzaffar Balkhi. Do we know all that was worth knowing, reliable, and certain about the life and times of the venerable spiritual leader and his devoted disciples and companions, worthy characters — socially, intellectually and culturally — and of hallowed associations? Many men of rank and position with their own individuality of character and conduct, piety and virtue, valour and fortitude, position and rank, and of distinction, who shone at their best in their respective spheres, vanished in obscurity. Ungrateful posterity allowed legends, idle gossips, guesses and conjectural references to give colour and fullness to many charactors, facts and events which had become historic uncertainties, and were shrouded in mists and mazes of antiquity and obscurity. Can we say how many people became non-entities, being disregarded and forgotten by the people of the time and of the future ? One can recall here the poetic line in English, "Many a gem of purest ray serene — The vast unfathomed ocean bears" A case in point is furnished by a broken basalt inscribed stone slab, discovered by chance, somewhere in Bhagalpur town. It takes us back to the time of Sultan Firoze Tughlaq and tells us of a

could not be taken as identical with, the material universe or the human soul. They held that the whole atmosphere around and everything in the universe was a manifestation and a reflex of the Divine, for we can have no reflexion of light without light.

How good and glorious was the time in Bihar when many like-minded seekers of God were engaged in the religious and moral pursuits, and being inspired by the discourses delivered by a great Shaikh and a learned Sufi of towering personality, they made history. Bihar at that time was directly under the Tughlaqs and, was a part of their vast Empire. They had an organised Government run by the formation of an efficient official class, working in the interest of peace and tranquillity and for the welfare of the people, under the orders of the crown. This was the period of great Sufic Institutional establishments, Khanqah's and Jama'at-khanas, serving not only as the hospices and resting places for travellers and way-farers but as homes for the weak, sick and the destitute. These establishments resounded with the lessons, delivered on theology, mysticism, scholastic philosophy, exegesis, law, ethics and morality. The Sufi Shaikhs expounded the outcome of their experimental knowledge, intuition or insight. There were discussions and dialogues on tenets of the faith, the way of the Sufis, and the spirit and meaning of the texts of the scriptures and the traditions or the sayings of the Prophet. The religiously devoted ones practised severe religious exercises, withdrawing themselves into seclusion, while others held Sama' or audition, indulging in ecstatic songs which were deemed a means of attaining communion with the Lord. The spiritual leaders made fervent exhortations to their fellow-men to pursue the path of truth and morality so as to lead honest and pure moral lives.

It was at this time that the pioneer of the Firdausi order of Muslim mysticism in India, Makhdum Sharafuddin Ahmad Maneri, had been persuaded to return from his wanderings on hills and jungles, and settle down in Bihar-town where he expounded his teachings, setting forth explanations and interpretations of the scriptural texts and of recorded reliable traditions. Not only principles of law and jurisprudence, philosophic subtleties of scholasticism but also dogmas and doctrines were brought home to the audience,

The 14th century is an important period in religious history, for there was an effulgence of mystical activities and considerable experiments of various forms of spirituality of great influence, both in the East and the West, Asia and Europe. Dame St. Juliana of Norwich, the anonymous author of the great classical and mystical writing, "The Clouds of the Unknown" which laid down that "by love the Absolute may be gotten and holden, but by thoughts and understanding never", and the great Flemish mystic, Jan van Ruybroeck, described by Evelyn Underhill, in the edition of his work (1293-1381), as "one of the very greatest in the world", had their counter-parts in Sufi savants and learned mystic Shaikhs all over northern India from Sindh, Multan and Delhi to Bihar and Bengal. It was an age of religious activities and mystic quest for the one, unknown, unknowable, and it was a time of great development of the mystic way of life, and a craving of human spirit to unite with, and get abiding rest in, the unseen Divine Reality The mystic sought knowledge of God through love and the medium of personal experience rather than of the reason. The 14th century was also a hey-day of many-sided activities and a period of bloom of religious and material prosperity. Sufism or Islamic mysticism was the prevailing form of religion of the Muslims. Here, in the area of the world we live in, Bihar, the mystical system, while emphasising the need of seeking direct communion of the soul with, and absorption into, the Infinite, the Eternal, evinced strong transcendental perception of Islam; they brought mysticism in close relation with theology and morality. They saw the creator through the creation, and they believed that the infinite, absolute and incomprehensible was the author of, and

The legendry ancestor of the Maliks of Bihar, Malik Ibrahim, or Malik Bayyu as he is popularly known, was the Governor of Bihar during the reign of Muhammad and Firoze Tughlaqs. Died in 753 A.H. (13th Zul Hijja), his mausoleum on Pir Pahari, the highest peak in Bihar Sharif, still dominates the surroundings.

Prof S. H. Askari has tried to determine the historical position of the great Malik and his times on the basis of epigraphical sources, the available historical material and family traditions.

Khuda Bakhsh Library, Patna.

Historical Fragments
Relating to
Malik Bayyu & His Times

By
Prof. S. H. ASKARI

Our Contributors :

- Dr. Mas'ud Husain (Aligarh), Nephew of Dr. Zakir Husain, D. Litt. from Paris, formerly Vice-Chancellor, Jamia Millia, Delhi and Professor of Linguistics, Usmania and Aligarh Universities. For details *see* p. 4 of this Journal.
- Mr. Khurshid Alam Khan (Delhi), Son-in-Law of Dr. Zakir Husain, Minister of State for Tourism & Civil Aviation, Govt. of India, For details *see* p. 26 of this Journal.
- Mrs. Saliha Abid Husain (Delhi), a co-worker of Dr. Zakir Husain, during Jamia Days, daughter of Khwaja Ghulam us-Saqalain and wife of Dr. S. Abid Husain; an eminent novelist & short story writer. For details *see* p. 36 of the Journal.
- Mr. Abdul Latif Azmi (Delhi), a student & co-worker of Dr. Zakir Husain during Jamia Days. Formerly editor of monthly 'Subh'; editor (and then Sub-editor) of monthly 'Jamia'. For details *see* p. 48 of this Journal.
- Mrs. Anis Kidwai (d. 1982), an eminent Writer of Urdu daughter of Wilayat Ali Bambuq, who was a co-worker of Maulana Mohammad Ali and died in his early age; sister-in-Law of Rafi Ahmad Kidwai. Formerly member of Rajya Sabha. For details *see* p. 66 of this Journal.
- Hm. Mohammad Imran Khan, Fellow, Arabic & Persian Research Institute, Tonk, Rajasthan.
- Hm. Wasim Ahmad Azmi, BUMS (Lucknow), Research Assistant Literary Research Unit (Unani Medicine), Khuda Bakhsh Library, Patna.
- Mr. Ahmad Yusuf (Patna), Urdu critic and short story writer.
- Mr. Rais Nomani, founder of Persian Academy, Lucknow; editor of Persian periodical 'Ibarat'.
- Dr. Kalim Sahsarami, D. Litt., Professor of Linguistics, Rajshahi University, Bangla Desh.
- Mr. Masarrat Husain Azad, Secretary Saulat Public Library, Rampur (U.P.), formerly editor, 'Al-Faruq' and 'Jauhar'.
- Mr. Mohammad Umar Saifi (Tonk), a devotee of Urdu Literature, possessing a remarkable collection of periodicals & letters of Urdu Poets and eminent Scholars.
- For others,

  See Journal Nos. 1, 12 & 16.

CONTENTS

Historical Fragments relating to Malik Bayyu & His times.	— by Prof. S. H. Askari	1
Dr. Zakir Husain – Personal Reminiscences (Urdu)	— by Dr. Masud Husain	1
	— by Mr. Khurshid Alam Khan	25
	— by Mrs. Saliha Abid Hussain	35
	— by Mr. Abdul Latif Azmi	47
	— by Mrs. Anis Kidwai	67
Books that Nourished them (Urdu)	— by 16 Eminent Writers	73
Some important manuscripts of Khuda Bakhsh Library (Urdu)	— by Hakim Md. Imran Khan	81
Ghalib, Yagana & Hasrat	—	87
Corrections and Additions :		
Printed Handlists of Arabic & Persian Manuscripts of the Library	— by Hm. Wasim Ahmad, Dr. A. R. Bedar & Mr. Mahboob Husain	89
Letters to the Editor :		
Inayat Khan Rasikh	— by Mr. Ahmad Yusuf	97
Editing of Manuscripts	— by Mr. Rashid Hasan Khan	98
	& Mr. Rais Nomani	99
Qamar Gayawi	— by Dr. Kalim Sahsarami	100
ADEEB (Allahabad)	— by Mr. Masarrat H. Azad	101
Ghazliyat-i-Salman Sauji	— by Mr. Md. Umar Saifi	102
New Acquisisitions :		
Abul Hasan Ali Nadvi's Convocation address of Kashmir University	—	103
Review :	-	
Farhang-i-Asafiyyah (5)	— by M. Q. A. Wadood	105

Editorial Committee :

Mr. Q. A. Wadood, Bar-at-law *(Chairman)*
Dr. S. H. Askari
Mr. A. F. Haider
Dr. A. R. Bedar *(Secretary)*

The Khuda Bakhsh Library Journal is a quarterly journal specialising in oriental studies in Arabic, Persian and Urdu languages, covering meaningful research based on the aterial preserved in the Khuda Bakhsh Oriental Public Library, or haveing any concern with it.

Articles will be accepted in English, Arabic, Persian and Urdu.

Notes and addenda, by way of corrections and additions to any information published in this Journal or in any publication of the Library e. g. Catalogues, will be a regular feature of the Journal.

Rs. 15-00 per copy

Annual subscription : Rs. 60.00 (Inland)
Pakistan : 12.00 Dollars
Europe : 8.00 Pounds
U.S.A. & Other Countries : 24.00 Dollars

Printers : Hindustan Printing Works, Rampur, U.P. &
Patna Litho Press, Patna-4
Publisher : Mahboob Husain, for Khuda Bakhsh O.P. Library, Patna

KHUDA BAKHSH LIBRARY

JOURNAL

19

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA